معارف

مارچ ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۵ | ماہ جمادی الاول ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۵ء | عدد ۳

فہرست مضامین

(مرتبہ)

اشتیاق احمد ظلی

محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

شبلی صدی کے تعلق سے جو مختلف پروگرام پیش نظر تھے اللہ کے فضل وکرم سے ان میں سے دو بحسن وخوبی انجام پذیر ہو چکے ہیں۔شبلی صدی سیمینار جس انداز اور معیار پر منعقد ہوا اور اسے جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔اس کے لیے ہم رب کریم کا جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے۔اس کے فوراً بعد معارف کا شبلی نمبر شائع کیا گیا۔اہل علم نے جس طرح اس کی پذیرائی کی وہ باعث تشکر وامتنان ہے۔تیسرا بڑا منصوبہ اس موقع کی مناسبت سے کچھ کتابوں کی اشاعت سے متعلق تھا جو مختلف مراحل میں پورے سال جاری رہے گا۔سیمینار میں اس سلسلۂ مطبوعات کی چھ کتابیں ریلیز کی گئی تھیں۔ان میں سیرت النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کا یادگار ایڈیشن بھی شامل تھا۔یہ آرزو تھی کہ اس تاریخی موقع پر علامہ شبلی کی کسی تصنیف کا یادگار ایڈیشن بھی شائع کیا جائے۔اگرچہ علامہ شبلی کی تمام تصنیفات وقت کے امتحان میں کھری اتر چکی ہیں اور سخت مزاج زمانہ بہت پہلے ان کے سلسلہ میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہے جس پر ان کے مسلسل شائع ہونے والے ایڈیشن بار بار مہر تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں۔اس کے باوجود ان میں جو مقام ومرتبہ سیرت النبیؐ کو حاصل ہے وہ کسی اور تصنیف کو نصیب نہیں۔ ان کی تصنیفات میں اس شاہکار کی حیثیت بلاشبہ گلِ سرِسبد کی ہے۔اس لیے فطری طور پر نگاہ انتخاب اسی پر جا کر ٹھہر گئی۔طبیعت اس بات پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکی کہ سیرت النبیؐ کی موجودگی میں کسی اور کتاب کا یادگار ایڈیشن شائع کیا جائے۔کتاب کی اہمیت اور اس کے موضوع دونوں کا تقاضا یہی تھا۔ چنانچہ اس کا نہایت دیدہ زیب یادگار ایڈیشن بھی ان مطبوعات میں شامل تھا جو اس موقع پر ریلیز کی گئیں۔حق تو یہ تھا کہ دارالمصنّفین کی پلیٹینم جوبلی کے موقع پر سیرت النبیؐ کے پورے سیٹ کا یادگار ایڈیشن شائع کیا جاتا لیکن وسائل کی کمی اس آرزو کی تکمیل میں مانع ہوئی۔یہ احساس بہر حال وجہ تسلی ہے کہ مناسبت شبلی صدی کی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے سوانح ان دو جلدوں میں آ گئے ہیں۔انشاءاللہ جب بھی حالات اجازت دیں گے سیرت النبیؐ کا مکمل سیٹ اسی انداز اور معیار پر شائع کیا جائے گا۔ان مطبوعات کے علاوہ شبلی صدی سال کے دوران کئی اور کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ ہے، جیسے جیسے وہ تیار ہوتی جائیں گی شائقین کی خدمت میں پیش کی جاتی رہیں گی۔شبلی صدی کے تعلق سے کئی اور منصوبے پیش نظر ہیں۔ان کے بارے میں اطلاعات فراہم کی جاتی رہیں گی۔

علامہ شبلی کی عظمت سیرت نبویؐ کی خدمت کی اساس پر استوار ہے۔ دارالمصنّفین کی اصل شناخت بھی سیرت نبویؐ کے خدمت گذار ادارہ کی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور سنت مطہرہ سے واقفیت کے بغیر اسلام کی تعلیمات اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی اور معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حیات مبارکہ کو ہمارے لیے اسوہ قرار دیا ہے۔ جب تک ہم اس اسوہ سے پوری طرح واقف نہ ہوں اس کے مطابق زندگی نہیں گذار سکتے۔ ان گوناگوں اسباب کی وجہ سے ضرورت محسوس کی گئی کہ شبلی صدی تقریبات اور دارالمصنّفین کی پلیٹینم جوبلی کی مناسبت سے کچھ ایسے پروگرام بھی ترتیب دیے جائیں جن کے ذریعہ خاص طور سے ہماری نئی نسل کے اندر سیرت طیبہؐ سے واقفیت کے رجحان کو تقویت ملے، اس کی ناگزیر ضرورت اور اہمیت کا احساس پیدا ہو اور اس کے مطالعہ کا ذوق پروان چڑھے۔ اس مقصد کے پیش نظر فیصلہ کیا گیا کہ مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے درمیان ملکی سطح پر سیرت نبویؐ کے موضوع پر مسابقۂ مقالہ نویسی کا اہتمام کیا جائے۔ اس کا موضوع ''مذہبی رواداری اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' طے کیا گیا ہے۔ مقالہ اردو، عربی، انگریزی یا ہندی زبان میں لکھا جا سکتا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے بالترتیب پندرہ ہزار، بارہ ہزار اور دس ہزار کے انعامات مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دو ہزار کے دس تشجیعی انعامات بھی دیے جائیں گے۔ سب سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ادارہ کو شبلی ٹرافی پیش کی جائے گی۔ تفصیلات کے لیے ہماری ویب سائٹ یا اکیڈمی کے آفس سے رجوع کیا جائے۔ رجسٹریشن فارم آن لائن بھرا جا سکتا ہے۔ اداروں کے ذمہ داروں سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں تعاون کی خصوصی درخواست ہے۔

ایک زمانہ تھا جب صاحب ذوق پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ''فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے'' سے بڑی کسی اور نعمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔ انقلاب زمانہ نے ذوق مطالعہ کو بری طرح متاثر بلکہ مجروح کیا ہے۔ اب نہ تو کتاب بینی کا وہ شوق باقی رہا اور نہ اس کے لیے فرصت، جو لوگ اب بھی کتاب بینی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور زندگی کے مسلسل بڑھتے ہوئے مطالبات اور تقاضوں کے درمیان اس کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیتے ہیں، ان کی ایک معتد بہ تعداد کے لیے

کتابوں کا حاصل کرنا ، ان کا ذخیرہ کرنا اور فرصت کے لمحات میں مطالعہ کے لیے کتاب کو ساتھ رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔آج کا مصروف انسان چاہتا ہے کہ وہ جب اور جہاں چاہے اس کی پسند کی کتاب اور رسالہ اس کی دسترس میں ہو۔سائنس کی ترقی نے اسے ممکن بھی بنادیا ہے۔اب ایسے آلات بازار میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے آدمی اپنی پسند کی بے شمار کتابیں ایک چھوٹے سے آلہ میں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے اور جہاں اور جب چاہے اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان کرسکتا ہے۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا لٹریچر معاشرہ کے اس طبقہ تک بھی پہنچے،جس کے لیے چھپی ہوئی کتاب کو ساتھ رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے،تو ہم کو بھی اپنا لٹریچر اسی انداز میں پیش کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔اسی ضرورت کے احساس کے زیر اثر گذشتہ چند برسوں سے دارالمصنّفین نے یہ کوشش کی ہے کہ دستیاب وسائل کی حدتک ان ذرائع کا استعمال کیا جائے اوران کے وسیلہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اسی ضرورت کے احساس کے تحت کئی سال پہلے معارف کو آن لائن فراہم کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔نیز اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے اکیڈمی اوراس کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں ضروری معلومات برابر ویب سائٹ پر مہیا کی جاتی ہیں۔اس جہت میں اکیڈمی نے گذشتہ دنوں ایک اوراہم قدم اٹھایا ہے۔اب اکیڈمی کا Press Reader سے معاہدہ ہوگیا ہے اور آیندہ انشاءاللہ معارف پریس ریڈر کے پلیٹ فارم پر دستیاب ہوگا۔پریس ریڈر کا مرکزی آفس کینیڈا میں ہے اور جدید ذرائع کے وسیلہ سے دنیا بھر میں رسائل و مجلّات اور دوسری مطبوعات کو فراہم کرانا اس کا اختصاص ہے،۱۱۰ ملکوں کے چار ہزار ناشرین اپنی مطبوعات کو شائقین تک پہنچانے کے لیے اس کے پلیٹ فارم کا استعمال کرتے ہیں۔اس وقت پندرہ ہزار لائبریریوں اور پانچ ہزار دوسرے اداروں کو پریس ریڈر کے ذریعہ رسائل،مجلّات اور دوسرا مطبوعہ مواد فراہم کیا جارہا ہے۔اس پلیٹ فارم سے رسائل و مجلّات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اسے کمپیوٹر ٹیبلیٹ ،ایپل،بلیک بیری اوراینڈرائڈ جیسے آلات کے ذریعہ پڑھا جاسکے۔وہ اس سلسلہ میں کئی اورسہولیات فراہم کرتے ہیں۔ہماری معلومات کی حدتک معارف پریس ریڈر کے پلیٹ فارم پر آنے والا پہلا اردو مجلّہ ہے۔ہمیں امید ہے کہ اس کے وسیلہ سے معارف کی پہنچ میں قابل لحاظ اضافہ ہوگا اور ہم دنیا کے مختلف گوشوں میں رہنے والے اُس اردوداں طبقہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے جو اس پلیٹ فارم کے حلقہ اثر میں ہے۔

مقالات

علمِ مناظر کے میدان میں ابن الہیثم کا عظیم کارنامہ

جناب الطاف احمد اعظمی

(۲)

قانون انعطاف: جب روشنی ایک لطیف واسطہ (Transparent Media) سے دوسرے لطیف واسطہ میں جس کی کثافت پہلے سے زیادہ ہوتی ہے، نفوذ کرتی ہے (مثلاً ہوا اور پانی) تو دونوں واسطوں کے درمیان سطح پر مڑ جاتی ہے ۔ اس واقعہ کو روشنی کا انعطاف (Refraction of Light) کہتے ہیں۔اس کے بھی کچھ متعین ضابطے ہیں۔مثلاً جب روشنی کی شعاع ہوا سے پانی میں خط عمودی میں داخل ہوتی ہے تو یہ مڑتی نہیں بلکہ عمود کی سیدھ میں نفوذ کر جاتی ہے، لیکن جب یہ کسی اور زاویے سے پانی میں داخل ہوتی ہے تو یہ خط عمودی کی سمت میں مڑ جاتی ہے۔روشنی کے اس طرز عمل کو قانون انعطاف (Law of Refraction) کہتے ہیں۔

ابن الہیثم نے انعطاف نور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کوئی متحرک جسم جب کسی جہت میں حرکت کرتا ہے تو اس کی حرکت یا تو ذاتی ہوتی ہے یا عرضی۔اگر وہ دوران حرکت کسی ایسے مانع سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی حرکت میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے تو لازمی ہے کہ وہ اس کی حرکت میں تبدیلی پیدا کر دے۔اگر ممانعت قوی ہوتی ہے تو اس کی حرکت کو اس جہت میں پھیر دیتی ہے جو اس کی جہت حرکت کے متضاد ہوتی ہے اور اگر ممانعت ضعیف ہے تو اس کی حرکت کو نہ تو جہت مخالف میں پھیرنے پر قادر ہوتی ہے اور نہ ہی اس جہت میں نفوذ کرا دینے کی صلاحیت رکھتی

آر زیڈ۔۹۰۱ بی، لین نمبر ۲۴، فلیٹ نمبر ۴۰۲، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹۔

ہے جس میں وہ متحرک ہوتی ہے البتہ اس کی حرکت متغیر ضرور ہو جاتی ہے۔طبعی متحرکات جو راست حرکت کرتے ہیں اگر وہ کسی جسم منفعل میں اس کے عمود پر نفوذ کرتے ہیں تو یہ نفوذ سہل ترین ہوتا ہے۔ہم اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔اگر کوئی شخص ایک پتلی تختی (لوح رقیق) لے اور اسے ایک وسیع سوراخ میں لگا دے اور اس کے کناروں کو میخوں سے مضبوطی کے ساتھ جکڑ دے۔اس کے بعد لوہے کے ایک گولے کو لے اور تختی کے مقابلہ کھڑا ہو اور گولے کو پوری قوت کے ساتھ تختی پر اس طرح پھینکے کہ گولے کی حرکت سطح لوح پر عمود قائم میں ہو تو وہ دیکھے گا کہ گولا تختی کو پھاڑ کر نفوذ کر گیا ہے۔اس کے برخلاف اگر وہ گولے کو تختی کے مقابل کھڑا ہو کر پھینکنے کے بجائے تھوڑا ترچھے طور پر کھڑا ہو کر پہلی بار کی طرح پوری قوت کے ساتھ پھینکے تو وہ تختی پر سے پھسل جائے گا اور اس سے تختی میں کوئی شگاف پیدا نہ ہو سکے گا بشرطیکہ وہ غایت درجہ پتلی نہ ہو، اور اس کی حرکت بھی اس جہت میں نہ ہو سکے گی جس میں وہ متحرک ہے بلکہ وہ دوسری جہت میں مڑ جائے گا''۔(۳۲)

اس سلسلے میں ابن الہیثم نے ایک دوسری مثال بھی دی ہے، لکھتا ہے ''اسی طرح اگر وہ ایک تلوار لے اور اپنے سامنے ایک مضبوط اور موٹی لکڑی رکھ لے اور اس پر تلوار سے ضرب لگائے بایں طور کہ تلوار کی دھار بالکل سیدھی ہو اور ضرب لکڑی کی سطح پر زاویۂ قائمہ پر واقع ہو تو وہ اس کو یقیناً قطع کر دے گی اور کم ہی اس کے خلاف ہوگا۔اس کے برخلاف اگر وہ تلوار کی دھار ترچھی کر لے اور خود بھی ترچھے طور پر کھڑا ہو کر لکڑی پر ضرب لگائے تو وہ قطع نہ ہو سکے گی، کبھی تو اس کا کچھ حصہ کٹ جائے گا اور کبھی تلوار اچٹ جائے گی۔تلوار کی ضرب جس قدر ترچھی پڑے گی اتنی ہی وہ کم زور ترین ثابت ہوگی''۔(۳۳)

ابن الہیثم نے ان تجربی مثالوں کی بنیاد پر انعطاف سے متعلق درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

۱- اس تجربہ سے واضح ہو گیا کہ عمود پر حرکت سہل ترین اور قوی ہوتی ہے اور عمود کے قریب جو حرکات مائلہ ہوتی ہیں ان کی حرکت عمود سے دور کی حرکات کے مقابلے میں سہل ہوتی ہے۔(۳۴)

۲- جب روشنی کسی جسم لطیف سے ملاقی ہوتی ہے جو اس جسم سے جس میں وہ خود ہوتی ہے، زیادہ کثیف ہوتا ہے تو وہ اس (روشنی) کو اس جہت میں نفوذ کرنے سے روکتا ہے جس میں

وہ متحرک ہوتی ہے۔ اگر یہ ممانعت (Resistance) زیادہ قوی نہیں ہے تو اس کو اس جہت میں لوٹانے سے قاصر رہتی ہے جہاں سے اس نے حرکت کی تھی اور اگر روشنی کی حرکت خط عمودی پر ہے تو وہ عمود پر اپنی قوت حرکت کی وجہ سے راست نفوذ کرتی ہے اور اگر اس کی حرکت خط مائل پر ہے یعنی ترچھے طور پر تو وہ اپنے ضعف حرکت کی وجہ سے راست نفوذ پر قادر نہیں ہوتی اس لیے وہ اس جہت میں مڑ جاتی ہے جس میں نفوذ کرنا اس کے لیے اس جہت سے آسان ہوتا ہے جس میں وہ متحرک ہوتی ہے۔(۳۵)

۳- انعطاف، اضوائے مائلہ کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ جب روشنی ترچھے طور پر ایک جسم لطیف سے گزر کر دوسرے جسم لطیف کی سطح سے ملاقی ہوتی ہے جو پہلے کے مقابلے میں کثیف ہوتا ہے تو وہ جسم لطیف کی اس سطح پر جو جسم کثیف سے ملحق ہوتا ہے، عمود کی جہت میں مڑ جاتی ہے۔(۳۶)

۴- جب روشنی جسم کثیف سے جسم لطیف میں پہنچتی ہے تو جہت عمود کے خلاف مڑ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو روشنی جسم لطیف میں حرکت کرتی ہے تو وہ اس کی راہ میں کم رکاوٹ ڈالتا ہے جب کہ جسم کثیف زیادہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے، مثلاً پتھر جب ہوا میں حرکت کرتا ہے تو اس کی حرکت تیز اور آسان ہوتی ہے اس حرکت کے مقابلے میں جب کہ وہ پانی میں حرکت کرتا ہے کیونکہ پانی ہوا سے کہیں زیادہ مدافعت کرتا ہے۔ جب روشنی جسم کثیف سے نکل کر جسم لطیف میں آتی ہے تو اس کی حرکت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ جب روشنی جسم لطیف کی سطح پر جو دو جسموں (لطیف و کثیف) کے درمیان فصل مشترک ہے، مائل ہوتی ہے تو اس کی حرکت عمود خارج اور عمود قائم (جو مبدئ حرکت کے عمود پر بنتا ہے) کے درمیان ہوتی ہے۔ اس حالت میں جسم کثیف روشنی کی رفتار میں اس جہت سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے جس میں عمود ثانی خارج ہوتا ہے۔ پس جب روشنی جسم کثیف سے نکل کر جسم لطیف میں جاتی ہے تو جسم لطیف اس میں اس جہت سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے جس میں عمود ثانی خارج ہوتا ہے اور یہ ممانعت جسم کثیف کی ممانعت کے مقابلے میں بہت قلیل ہوتی ہے اس لیے روشنی کی حرکت اس جہت میں ہو جاتی ہے جدھر سے ممانعت زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح روشنی جسم لطیف میں جہت عمود کے خلاف مڑ جاتی ہے۔(۳۷)

ابن الہیثم نے انعکاس و انعطاف سے متعلق قدماء کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے،

مثلاً یہ غلط خیال جو دراصل اقلیدس (Euclid) کی ''کتاب المناظر'' سے ماخوذ تھا، عام تھا کہ زاویۂ واقع (Angle of Incidence) اور زاویۂ منعطفہ (Angle of Refraction) مساوی ہوتے ہیں۔ اس غلط خیال کا ذکر کمال الدین فارسی نے بھی اپنی کتاب ''تنقیح المناظر'' میں کیا ہے، لکھتا ہے:

> ''میں ایک زمانہ دراز تک مناظر کی تحقیق میں منہمک رہا یعنی کس طرح بصر (آنکھ) صورتوں کا ادراک کرتی ہے، اس سلسلے میں انعطاف کے مسائل پر بالخصوص غور کرتا رہا۔ میں پانی اور بلور کے پیچھے عجیب وغریب شکلیں دیکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اقلیدس کی ''کتاب المناظر'' کی غلطیاں بھی میرے پیش نظر تھیں۔ میں نے بعض حکماء کے کلام میں یہ مسئلہ لکھا ہوا دیکھا کہ سورج سے روشنی سیدھے خط میں نکلتی ہے اور جب سطح جیسے پانی کی سطح سے ملاقی ہوتی ہے تو وہ مساوی زاویوں میں منعکس ہوجاتی ہے اور صرف اس سمت میں نفوذ کرتی ہے جدھر سے اشراق ہوتا ہے اور اس سمت میں مڑ جاتی ہے جدھر سے انعکاس ہوتا ہے اور اس طرح چار مساوی زاویے بنتے ہیں یعنی زاویۂ استقامہ، زاویۂ انعکاس، زاویۂ نفوذ اور زاویۂ انعطاف۔ میں قدماء کے ان امور واحکام کو پڑھ کر حیرت کرتا تھا''۔ (۳۸)

ابن الہیثم نے قدماء کی متذکرہ غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے بتایا کہ زاویۂ واقع اور زاویۂ منعطفہ یکساں نہیں ہوتے جیسا کہ قوانین انعطاف کے ذکر میں بیان کیا جاچکا ہے۔

قوانینِ انعکاس وانعطاف کی روشنی میں بعض مظاہر فطرت کی تشریح

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیدھی لکڑی جب پانی میں ڈوبی ہوتی ہے تو وہ دیکھنے میں بڑی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح پانی سے بھرے ہوئے پیالہ میں پڑا ہوا سکہ کچھ اوپر اٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چاند اور سورج جب افق کے قریب ہوتے ہیں تو وہ بڑے

دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ تاروں کا جھلملانا،قوس قزح کی خوش رنگی اور صبح وشام کے اوقات میں شفق کے خوش نما مناظر وغیرہ وہ واقعات ہیں جن سے برابر ہمارا سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔

آج سائنس ترقی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ ان واقعات ومناظر کی حقیقت سے ہم پورے طور پر آگاہ ہو چکے ہیں،لیکن ابن الہیثم کے عہد سے پہلے اور اس کے بعد بھی بہت دنوں تک لوگ ان مناظر کی حقیقت سے بے خبر رہے۔کمال الدین فارسی نے ''تنقیح المناظر'' میں لکھا ہے کہ علم مناظر میں اہم چیز قانون انعطاف کا جاننا ہے۔سورج اور ستارے افق کے قریب بڑے اور وسط میں چھوٹے نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ روشنی کا انعطاف ہے لیکن اس وقت تک جو کتابیں علم مناظر سے متعلق لکھی گئی تھیں،مثلاً اقلیدس کی ''کتاب المناظر'' وغیرہ ان میں اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔چنانچہ میں نے اس کا تذکرہ اپنے استاد قطب الدین شیرازی سے کیا۔انہوں نے تھوڑے سے توقف کے بعد بتایا کہ ایران کے کسی کتب خانہ میں ابن الہیثم کی ایک کتاب دو بڑی جلدوں میں دیکھی ہے۔آخر کار اسے یہ کتاب ملی۔(۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں ابن الہیثم وہ واحد سائنس داں تھا جس نے سب سے پہلے مذکورہ بالا واقعات ومناظر کی صحیح سائنسی توجیہ پیش کی اور ان کی اصل حقیقت سے دنیا کو بالکل صحیح طور پر آگاہ کیا۔

اس نے بتایا کہ روشنی کی شعاعیں اپنے سفر میں جو راستہ اختیار کرتی ہیں اور ان میں انعکاس یا انعطاف کا جو عمل واقع ہوتا ہے اس سے عینی مغالطہ پیدا ہوتا ہے،اس لیے ہماری قوت باصرہ ہر حال میں معتبر رہ نما نہیں بن سکتی ہے۔ابن الہیثم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ جیسے جیسے بلندی کی طرف جایا جائے فضا کی کثافت (Density) کم ہوتی جاتی ہے،اس بنیاد پر اس نے کہا کہ روشنی کی شعاع جب فضا میں ترچھے (Obliquely) داخل ہوتی ہے تو وہ خمیدہ راستہ (Curvilinear Path) اختیار کرتی ہے جو زمین کی جہت میں قوسی (Concave) ہوتا ہے۔دماغ کسی چیز کے مقام کو اس سمت میں محسوس کرتا ہے جس سمت سے روشنی کی شعاع آنکھ میں داخل ہوتی ہے اور اسی لیے اجرام ساویہ کے اصل مقام کے تعین میں ہماری آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں،ہم انہیں سمت الراس (Zenith) میں دیکھتے ہیں جب کہ ان کی اصل جگہ وہ نہیں ہوتی۔اس

کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ہم ستاروں کو خط مماس (Tangent) میں دیکھتے ہیں لیکن جب روشنی آنکھوں تک پہنچتی ہے تو وہ خمیدہ ہوکر منعطف ہوتی ہے اس لیے ہم انہیں ان کے اصل مقام پر دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ابن الہیثم نے بتایا کہ اسی وجہ سے ہم سورج اور چاند کو ان کے طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد بھی دیکھتے ہیں اور یہ عجیب وغریب فریب ہے۔ ابن الہیثم نے یہ بھی بتایا کہ ہوا سے گزرتی ہوئی شعاع کا خم (Curvature) کثافت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے۔ انعطاف میں اس تنوع (Variation) کے واقع ہونے کی وجہ سے ثوابت (Fixed Stars) جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ چاند اور سورج جب افق پر ہوتے ہیں تو وہ ہم کو بڑے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ہمارا عینی مغالطہ ہے اور اس کا سبب عمل انعطاف ہے جو ارضی اشیاء (Terrestrial Objects) کے درمیان میں حائل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ابن الہیثم نے مزید بتایا کہ عمل انعطاف ہی کے اثر سے سورج کی رویت (Visibility) بڑھ جاتی ہے اور بایں طور رات کا اور تاریکی کا وقفہ کم ہوجاتا ہے۔

ابن الہیثم نے بالکل صحیح طور پر ہوا کے انعکاسی عمل (Reflecting Action of the Air) کی بنیاد پر شفق کی نہایت خوبصورت توجیہ پیش کی ہے (۴۰)۔ اس نے اس کے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ شفق اس وقت شروع اور ختم ہوتی ہے جب سورج افق سے ۹۰ ڈگری نیچے ہوتا ہے اور اس اصول پر اس نے سب سے پہلے بالکل صحیح طور پر فضائی بلندی (Atmospheric Height) کا اندازہ لگایا (۴۱) اور بتایا کہ یہ ساڑھے اٹھاون میل ہے۔ (۴۲)

ابن الہیثم نے سب سے پہلے کیمرہ ابسکیورا (Camera Obscura) (۴۳) کا استعمال کیا (۴۴)۔ اس نے گرہن کے دوران میں ایک کھڑکی کے کواڑ میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنا کر اس کے مقابل کی دیوار پر سورج کے نیم قمری عکس کو دیکھا اور یہ گویا کیمرہ ابسکیورا کا پہلا مشاہدہ تھا۔ (۴۵) اسی مشاہدہ کا نتیجہ فوٹو کیمرہ کی ایجاد ہے جس سے آج عکس کشی کی جاتی ہے۔

نظریۂ ابصار (Theory of Vision): انسان اشیاء کو کیوں کر دیکھتا ہے؟ یہ بظاہر ایک سادہ سا سوال ہے اور اس کا جواب بھی سادہ طور پر دیا جاسکتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن یہ بات کہ آنکھیں کس طرح چیزوں کو دیکھتی ہیں ایک پیچیدہ سوال بن جاتا ہے۔ اس پیچیدہ

سوال کا جواب متقدمین یعنی یونانی، اسکندری اور ہندی ارباب علم وکمال نے جس طور پر دیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اس باب میں ابن الہیثم کے جواب کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نہیں اور اس کا علم و فضل سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے قدماء کے خیالات نقل کردیے جائیں اس کے بعد ابن الہیثم کی گراں قدر تحقیق پیش کی جائے۔

فیثاغورث (Pythagoras, 580-C500 B.C.) جو ایک معروف یونانی فلسفی اور ریاضی داں تھا اور اس کے متبعین کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ اشیاء مرئی سے ذرات نکل کر جب آنکھوں تک پہنچتے ہیں تو اس سے آدمی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ یہ نظریہ نیوٹن کے نظریہ کے بہت قریب ہے۔ فیثاغورث کا یہ نظریہ زیادہ دن نہیں چل سکا اور ابندقلیس (Empedocles, 493-433 B.C.) نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ موجودات عالم عناصر سے مل کر بنے ہیں۔ اس کے نزدیک عالم وجود میں دو قوتیں کام کررہی ہیں، ایک محبت یا الفت کی قوت اور دوسری عداوت یا بغض کی۔ محبت کے عامل کے توسط سے عناصر ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں یعنی ہر مثیل اپنے مثیل سے اور ہر نوع اپنی نوع سے ملتی ہے اور عداوت کے عامل سے انواع اپنے غیر سے اور اشباہ اپنے اضداد سے دور بھاگتے ہیں۔ اس کے نزدیک ادراک نام ہے موجودات خارجی میں موجود عناصر کا اتصال، ان عناصر سے جو انسان میں موجود ہیں اور ابصار (Vision) یہ ہے کہ آنکھوں سے عناصر نکل کر ان عناصر سے مل جاتے ہیں جو اشیاء مرئی (Visible things) سے نکلتے ہیں اور انہی کے اتصال سے دیکھنے کا عمل واقع ہوتا ہے۔ (۴۶)

افلاطون (Plato, 428-348 B.C.) نے ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق آنکھ سے ایک شئے خارج ہوتی ہے جس کو اس نے "نار الٰہیہ" یا "قوت نوریہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا تعلق جنس نور سے ہے جو اپنی ذات سے روشن اجسام (اجسام مضیئہ بذاتہ) سے خارج ہوتی ہے اور اس سے کثیف اجسام روشن ہوجاتے ہیں۔ جب یہ "نار الٰہیہ" دن کی روشنی میں خارج ہوتی ہے تو وہ اپنے نوع کے نور سے مل جاتی ہے اور جب مثل اپنے مثل سے اس کیفیت کے ساتھ متحد ہوتا ہے تو اس سے وہ شعاع بنتی ہے جس سے آنکھ شے مرئی کو دیکھتی ہے

لیکن تاریکی میں نور نہیں ہوتا اور آنکھ سے خارج ہونے والی ''نار الٰہیہ'' اپنے نوع کے نور سے مل نہیں پاتی جس کی وجہ سے وہ اتصال ہی واقع نہیں ہوتا جس سے کہ شعاع بن سکے اور بایں صورت ''نار الٰہیہ'' برباد ہو جاتی ہے اور چیزوں کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔(۴۷)

افلاطون کے بعد اس مسئلہ پر ارسطو (Aristotle, 384-322 B.C.) جیسے عالی دماغ اور روشن فکر مفکر نے غور کیا اور افلاطون کے خیال کی تردید کی لیکن اس نے خود جو نظریہ پیش کیا وہ بھی اصل حقیقت کی نقاب کشائی نہ کر سکا۔اس نے بتایا کہ روشنی ایک صفت یا عارضی کیفیت ہے جو شفاف واسطے کے ذریعہ جو آنکھ اور شے مرئی کے درمیان ہوتا ہے، ظاہر ہوتی ہے۔اس نے اس بات سے انکار کیا کہ روشنی بذات خود اپنا کوئی وجود رکھتی ہے یا یہ کہ وہ حرکت قبول کرتی ہے یا یہ کہ وہ ایک شے ہے جو شے مرئی سے نکلتی ہے۔وہ فی الواقع ایک صفت عارضہ ہے جو شفاف واسطے پر طاری ہوتی ہے اور جب یہ کیفیت اس سے زائل ہو جاتی ہے تو اسی کا نام تاریکی ہے۔ ابصار دراصل ایک انطباع ہے جو آنکھوں میں واقع ہوتا ہے نہ کہ شے مرئی سے کوئی چیز نکل کر آنکھوں تک آتی ہے۔

لیکن بعد کے فلاسفہ نے ارسطو اور افلاطون دونوں کے نظریات کو رد کر دیا۔اس سلسلے میں اپیقورس (Epicurus, 341-270 B.C.) کا نام قابل ذکر ہے۔اس نے ارسطو کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل شے مرئی کی صورت آنکھوں تک آتی ہے اور اس سے چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔فلسفۂ اپیقورین کے عہد عروج میں ہی ایک دوسرا فلسفہ بھی مقبول تھا اور یہ رواقیین کا فلسفہ تھا اور اس کا سرخیل زینو سیٹومی (Zeno of Citium, 334-262 B.C.) تھا۔اس کے خیال کے مطابق صرف مادہ ہی وجود رکھتا ہے کیونکہ وہ محسوس ہوتا ہے۔ایک جسم دوسرے جسم میں اسی وقت موثر ہوتا ہے یا فعل کرتا ہے جب وہ ایک دوسرے کو مس کرتے ہیں۔ادراک کا معاملہ بھی یہی ہے جو اس کے توسط سے ظاہر ہوتا ہے۔فعل ابصار بھی اسی وقت ممکن ہے جب عضو حساس (Sensory Organ) کے درمیان مادی یا فعلی اتصال ہو اور یہ آنکھ اور شے مرئی کے درمیان ہوتا ہے۔اس کی کیفیت یہ ہے کہ آنکھ سے ایک مخروطی شکل کی شعاع نکلتی ہے جس کا راس آنکھ کے پاس اور اس کا قاعدہ (Base) شے مرئی کی سطح پر ہوتا ہے۔جب آنکھ سے یہ شعاع نکلتی ہے اور شے مرئی پر پڑتی

ہے تو فعل ابصار واقع ہوتا ہے گویا آنکھ جو عضو حساس ہے پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ وہ شے مرئی کو مس کرتی ہے۔(۴۸)

یہی نظریہ ہندی فلاسفہ میں بھی مروج ومقبول تھا یعنی یہ کہ آنکھ سے شعاع نکلتی ہے اور اس سے چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اسکندری عہد (۳۰۰ ق م) کے جملہ علمائے ریاضی وفلکیات جن میں اقلیدس (۴۹) اور بطلیموس بھی شامل ہیں،اسی نظریے کے قائل تھے۔

یہ تو ہندی، یونانی اور اسکندری علما کا حال تھا۔ابن الہیثم سے پہلے جو مسلم وغیر مسلم محققین گزرے مثلاً ابن اسحاق کندی (م ۸۷۳ء)،حنین بن اسحاق (م ۸۷۷ء)،قسطا بن لوقا (م ۹۱۲ء)، رازی (م ۹۲۶ء) اور ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) وغیرہ،انہوں نے یونانی اور اسکندری علما کی کتابوں پر شرحیں لکھیں اور ان کے اسرار وغوامض کو واضح کیا اور ان کے براہین ہندسیہ کے اغلاط کو درست کیا لیکن نظریہ نور میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہ کر سکے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن الہیثم کے بعد کے مسلم علمائے ریاضی وفلکیات مثلاً نصیر الدین محقق طوسی (م ۱۲۷۴ء) اور قطب الدین شیرازی (م ۱۳۱۱ء) وغیرہ بھی قدماء کے نظریۂ ابصار کی غلطی کو محسوس نہ کر سکے۔نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب ''تلخیص المحصل'' میں لکھا ہے:

> ''کسی چیز کا دیکھنا دو طریقوں سے ممکن ہے،یا تو شے مرئی آنکھوں میں منطبع ہوتی ہے یا آنکھوں سے شعاع نکل کر شے مرئی تک جاتی ہے اور یہی قول حق سے زیادہ قریب ہے،جو شخص اس قول کی تردید کرتا ہے ہم کو اس کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے''۔(۵۰)

مذکورہ بالا تفصیل سے بالکل واضح ہے کہ ابن الہیثم کے عہد تک بلکہ اس کے بعد کے جملہ ارباب علم وتحقیق ابصار کی حقیقت سے قطعاً بے خبر تھے اور غلط طور پر سمجھتے تھے کہ آنکھوں سے شعاع نکل کر شے مرئی تک جاتی ہے اور اس سے وہ نظر آتی ہے۔اس نظریے کی غلطی کی واحد وجہ یہ تھی کہ انہوں نے محض قیاس عقلی کا استعمال کیا اور اس کی بنیاد پر فعل ابصار کی وضاحت کی،کسی نے علم تجربی کی مدد سے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔یہی وجہ ہے کہ اپنی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور فکر عمیق کے باوجود وہ اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکے۔

ابن الہیثم پہلا شخص ہے جس نے علم تجربی کی بنیاد پر فعل بصر کی ٹھیک توجیہ پیش کی۔

قدماء کے نظریہ نور کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اگر دیکھنے کا عمل اس چیز سے ہوتا ہے جو آنکھ سے خارج ہوتی ہے اور شے مرئی تک جاتی ہے تو یہ شے یا تو جسم ہوگی یا غیر جسم۔ اگر جسم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جب آسمان اور اس کے کواکب کو دیکھتے ہیں اور ان پر تامل کرتے ہیں تو عین اس وقت ہماری آنکھوں سے ایک شے نکل کر زمین و آسمان کے مابین جو کچھ ہے اس کو بھر دیتی ہے اور آنکھ میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس میں استحالہ لازم ہے اور یہ اپنی غایت شناعت کی وجہ سے محال ہے۔ پس ابصار اس شے (جسم) سے نہیں ہوتا جو آنکھ سے نکلتی ہے اور اگر وہ غیر جسم ہے تو یہ چیز شے مرئی کا ادراک نہیں کرسکتی ہے کیونکہ اجسام ذی حیات ہی قابل احساس ہوتے ہیں۔ پس اس سے بھی ثابت ہوا کہ آنکھ سے کوئی چیز نکل کر شئے مرئی تک نہیں جاتی جس سے اس کا احساس ہوتا ہے''۔(۵۱)

اوپر ابن الہیثم نے جس گروہ علما کے نظریے کی تردید کی ہے وہ اصحاب تعالیم (Mathematicians) تھے۔ فلسفۂ طبیعین (Natural Philosophers) کا نظریہ اس کے برعکس تھا یعنی شے مرئی سے صورت (Form) نکل کر آنکھ تک جاتی ہے اور آنکھ اس شے کا ادراک کرتی ہے۔ ابن الہیثم نے اس نظریے کو ناکافی و نامکمل قرار دیا اور تفصیل سے بتایا کہ اشیائے مرئی کا ادراک حسب ذیل شرائط پر منحصر ہے:

۱- شئے مرئی بذات خود روشن ہو یا کسی اور ذریعہ سے نور لے کر منور ہو۔ ۲- شے مرئی اور آنکھ کے درمیان بُعد ہو۔ ۳- شے مرئی آنکھ کے مقابل ہو۔ ۴- شے مرئی اور آنکھ کے درمیان شفاف واسطہ ہو۔ ۵- شے مرئی اور آنکھ کے درمیان کوئی جسم کثیف حائل نہ ہو۔ ۶- شے مرئی کی سطح کے ہر نقطہ اور آنکھ کی سطح کے درمیان (قیاسی) خط مستقیم یا خطوط مستقیمہ ہوں اور کوئی جسم کثیف درمیان میں آکر اس کو قطع نہ کرے۔ ۷- شے مرئی حجم کے اعتبار سے غایت درجہ چھوٹی نہ ہو۔ ۸- شے مرئی غایت درجہ لطیف نہ ہو جیسے ہوا۔(۵۲)

شرط اول کی وضاحت کرتے ہوئے ابن الہیثم نے لکھا ہے کہ ''شے مرئی جب روشنی سے محروم ہوجاتی ہے تو آنکھ اس کے ادراک سے قاصر رہتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنکھ جب کسی تاریک مقام میں ہوتی ہے تو وہ شے مرئی کا ادراک کرلیتی ہے جب کہ وہ اس کے مقابل ہوتی ہے اور منور

ہوتی ہے اور ہوا ان کے درمیان متصل ہوتی ہے، اجسام کثیفہ کی وجہ سے متخلخل نہیں ہوتی۔اس کے برخلاف جب شے مرئی تاریک جگہ میں ہوتی ہے اور وہاں روشنی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور آنکھ منور جگہ پر ہوتی ہے تو آنکھ اس شے کے احساس وادراک سے عاجز ہوتی ہے۔پس اس سے واضح ہوگیا کہ جب شے مرئی منور ہوتی ہے تو اس وقت آنکھ اس کے ادراک پر قادر ہوتی ہے''۔(۵۳)

شرط سوم کی وضاحت میں ابن الہیثم نے لکھا ہے کہ ''ہم دیکھتے ہیں کہ جب شے مرئی آنکھ کے مقابل ہوتی ہے تو وہ اس کو محسوس کر لیتی ہے لیکن جب وہ آنکھ کے مقابل سے ہٹ جاتی ہے تو اس کے ادراک سے قاصر رہتی ہے اور جب دوبارہ شے مرئی آنکھ کے مقابل آجاتی ہے تو احساس لوٹ آتا ہے۔اسی طرح ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جب آنکھ شے مرئی کا احساس کر لیتی ہے اور پھر پپوٹوں کو بند کر لیتی ہے تو احساس باطل ہوجاتا ہے اور جب انہیں کھول دیتی ہے اور شے مرئی اس کے مقابل آجاتی ہے تو احساس عود کر آتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب احساس باطل ہوجاتا ہے تو معلول خود بخود باطل ہوجاتا ہے اور جب علت واپس آجاتی ہے تو معلول بھی واپس آجاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ علت ابصار شے مرئی ہے اور جب معاملہ یہ ہے اور شرائط ابصار میں ہے (جس کا تذکرہ ہو چکا) کہ شے مرئی منور ہو اور آنکھ اور شے کے درمیان کوئی جسم کثیف حائل نہ ہو تو اس سے ثابت ہوا کہ ابصار اس روشنی کی تاثیر سے ہوتا ہے جو شے مرئی سے آنکھ پر وارد ہوتی ہے''۔(۵۴)

ابن الہیثم نے نہ صرف ابصار (Vision) کے متعلق اپنے پیش رووں کی غلطی کی اصلاح کی بلکہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ کس طرح شے مرئی کی شکلیں آنکھوں میں بنتی ہیں اور آنکھیں ان کا ادراک کرتی ہیں۔یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے صاحب علم سے انجام نہ پاسکا۔اس سلسلے میں جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے:

''ابن الہیثم نے بتایا کہ قرنیہ (Retina) ہی مرکز بصر ہے۔روشنی سے اس میں جو تاثیرات وتحریکات پیدا ہوتی ہیں وہ عصب بصری (Optic nerve) کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہیں۔اس تشریحی ومنافع الاعضائی حقیقت (Anatomical and Physiological truth) کو ابن الہیثم سے پہلے کسی نے بیان نہ کیا تھا اور نہ اس وقت ایسا کرنا ممکن تھا۔ان حقائق کا انکشاف وہی شخص بخوبی کرسکتا تھا جس نے اعضائے انسانی کا عملی مشاہدہ چیر

پھاڑ (Disection) کے ذریعہ کیا ہو جو اس وقت ممنوع تھا۔ابن الہیثم نے نہایت خوبی و صحت کے ساتھ بتایا کہ ہم کسی چیز کو دونوں آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ایک کیوں دیکھتے ہیں۔اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ نظری اشکال (Visual Images) دونوں قرنیہ کے متناسب حصے (Symmetrical Portion) پر بنتی ہیں۔جدید فزیالوجی کے ماہرین کے لیے یہ مبنی بر حقیقت انکشاف نہایت حیرت انگیز ہے''۔(۵۵)

ابن الہیثم کی تحقیقات ابصار سے متعلق ڈریپر کے مذکورہ بالا بیان کو ہم خود اس کی کتاب ''کتاب المناظر'' کی مدد سے اور واضح کرنا چاہتے ہیں۔

ابن الہیثم نے آنکھ کی جو ساخت بیان کی ہے وہ جالینوسی تشریحات کے مطابق ہے(۵۶) لیکن اس نے اس ساخت کی جیومیٹری کو اپنے نظریۂ ابصار کی توضیح میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس نے ثقب عنبیہ (Pupil) کے مقابل قرنیہ (Retina) کی دونوں سطحوں کو رطوبت جلیدیہ (Crystalline Humour) کی اندرونی سطح (Interior Surface) کے متوازی قرار دیا ہے۔یہ تمام سطحیں مدور (Spherical) ہیں اور مرکز چشم ان سب کے لیے ایک مشترک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان تشریحی حقائق کے بعد آیئے دیکھیں کہ عمل ابصار کس طرح وقوع میں آتا ہے۔جسم منور دراصل نقاط کا مجموعہ (Collection of Points) ہے جس میں سے ہر نقطہ انفرادی طور پر اپنی روشنی اور رنگ کی صورت (Form) کو خط مستقیم میں تمام سمتوں میں خارج کرتا ہے۔ابن الہیثم لکھتا ہے:

> ''شے مرئی کی سطح کے ہر نقطہ سے روشنی اور رنگ کی صورت آنکھ تک جاتی ہے اور جب یہ آنکھ کی سطح سے ملاقی ہوتی ہے تو کوئی شے بھی طبقات چشم کے شفاف جسم میں سیدھی نفوذ نہیں کرتی بجز اس شے کے جو سیدھے خط میں زاویۂ قائمہ پر چل کر آنکھ کی سطح تک آتی ہے۔ان کے علاوہ جو خطوط ہوتے ہیں وہ سیدھے نفوذ نہیں کرتے بلکہ مڑ جاتے ہیں''۔(۵۷)

مذکورہ بالا اصول کے مطابق جسم مرئی کے ہر نقطہ کو اخراج نور کے مخروط (Cone) کی اصل قرار دینا ہوگا جس کا قاعدہ عنبیہ کے مقابل آنکھ کی سطح کے حصہ پر ہوگا۔اس مخروطہ کی وضاحت کرتے ہوئے ابن الہیثم نے لکھا ہے:

''جب آنکھ کسی شے مرئی کے مقابل ہوتی ہے تو مرکز چشم اور آنکھ کے مقابل اس شے مرئی کی سطح کے درمیان ایک مخروط بنتا ہے جس کا راس مرکز چشم اور اس کا قاعدہ اس شے مرئی کی سطح ہوتی ہے اور جب آنکھ اور شے مرئی کے درمیان ہوا متصل ہوتی ہے اور ان کے درمیان کوئی جسم کثیف حائل نہیں ہوتا اور شے مرئی کسی بھی نوع کی روشنی سے منور ہوتی ہے تو روشنی اور رنگ کی صورت جو شے مرئی کی سطح میں ہوتی ہے، اس مخروطہ کی سمت میں آنکھ تک پھیل کر آتی ہے اور شے مرئی کی سطح کا ہر نقطہ اس سیدھے خط میں پھیلتا ہے جو اس نقطہ اور راس مخروط (مرکز چشم) کے درمیان ہوتا ہے''۔(۵۸)

آنکھ کی جیومیٹری سے صاف ظاہر ہے کہ جسم مرئی کے تمام نقاط سے جو شکلیں عمودی خط کے ساتھ آنکھ کی سطح تک آتی ہیں وہ عنبیہ کی راہ سے بغیر منعکس ہوئے رطوبت بیضیہ (۵۹) (Albumineous Humour) میں داخل ہوجاتی ہیں اور پھر رطوبت جلیدیہ (Crystalline Humour) کی اندرونی سطح کو زاویۂ قائمہ (Right Angle) پر مس کرتی ہیں اس کے نتیجے میں رطوبت جلیدیہ کے اس مقام پر ایک ایسی مکمل شکل بنتی ہے جس کے تمام نقاط ایک ایک کر کے شے مرئی کے تمام نقاط سے مشابہ ہوتے ہیں اور اس نمایاں اور عمودی شکل کو جلیدیہ محسوس کرتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ احساس سب سے پہلے رطوبت جلیدیہ ہی میں ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس رطوبت کو فعل ابصار میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ابن الہیثم نے لکھا ہے کہ ''آنکھ کے طبقات متقدمہ کے ذریعہ دیکھنے کا فعل وقوع میں نہیں آتا۔ان کی حیثیت آلات کی ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر رطوبت جلیدیہ میں کوئی آفت لاحق ہوتی ہے اور باقی طبقات محفوظ رہتے ہیں تو ابصار باطل ہوجاتا ہے اور اگر رطوبت جلیدیہ محفوظ رہتی ہے لیکن دوسرے طبقات میں ان کے شفاف اجزا کو چھوڑ کر، کوئی آفت لاحق ہوتی ہے تو ابصار باطل نہیں ہوتا ہے۔اسی طرح اگر ثقب عنبیہ میں کوئی سدہ پیدا ہوجائے اور اس کی شفاف رطوبت کو باطل کردے تو قرنیہ کے سلامت رہنے کے باوجود ابصار باطل ہوجاتا ہے اور جب سدہ زائل ہوجاتا ہے تو ابصار واپس آجاتا ہے۔ اسی طرح رطوبت بیضیہ کے اندر کوئی غیر شفاف اور غلیظ جزء پیدا ہوجائے اور وہ رطوبت جلیدیہ اور ثقب عنبیہ کے وسط میں ہو تو ابصار باطل ہوجاتا ہے اور جب یہ جزء غلیظ زائل ہوجاتا ہے یا جلیدیہ

اور ثقب عنبیہ کے درمیان سمت مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری سمت میں چلا جائے تو ابصار واپس لوٹ آتا ہے۔فن طب اس پر شاہد ہے۔اس سے واضح ہو گیا کہ احساس طبقات متقدمہ کے بجائے رطوبت جلید یہ سے ہی ہوتا ہے۔کسی جسم کثیف کے ذریعہ رطوبت جلید یہ اور سطح چشم کے درمیان شفاف واسطے کا انقطاع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ احساس سطح چشم کے بجائے رطوبت جلید یہ کے پاس ہوتا ہے۔اسی طرح رطوبت جلید یہ اور سطح چشم کے درمیان سمت مستقیم کے انقطاع سے احساس باطل ہو جاتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رطوبت جلید یہ کا احساس صرف اس سمت مستقیم میں ہوتا ہے جو اس کے اور سطح چشم کے درمیان ہوتی ہے''۔(٦٠)

آگے اس نے مزید لکھا ہے کہ ''رطوبت جلید یہ کا کچھ حصہ شفاف اور کچھ غیر شفاف ہوتا ہے، جو حصہ شفاف ہوتا ہے وہ روشنی اور رنگ کے فارم کو قبول کرتا ہے اور جہاں تک اس میں شفافیت ہوتی ہے وہاں تک فارم نفوذ کرتا ہے لیکن جو حصہ غیر شفاف ہوتا ہے وہ اس کے نفوذ میں مانع ہوتا ہے اور فارم (صورت) اس کی سطح اور جسم میں کثافت کے باعث ثبت ہو جاتا ہے جیسا کہ اجسام کثیفہ کی سطوح کے تذکرہ میں ہم واضح کر چکے ہیں''۔(٦١)

روح بصری (Visual Spirit) جو دماغ سے عصب بصری (Optic Nerve) تک آزادانہ متوازی خطوط کے ساتھ ساتھ جاری وساری ہے، آخر الامر رطوبت زجاجیہ (Vitreous Humour) سے فارم (٦٢) کو حاصل کرتی ہے اور انہی خطوط کے ذریعہ فارم کو دماغ کے مقدم حصے تک پہنچاتی ہے جہاں تقاطع بصری (Optic Chiasma) میں عمل ابصار (Process of Vision) تکمیل کو پہنچتا ہے۔تقاطع بصری وہ مقام ہے جہاں اعصاب بصری کے مشابہ خطوط باہم ملتے ہیں، ایک آنکھ کا فارم دوسری آنکھ کے فارم کے ساتھ منطبق ہوتا ہے اور پھر یہاں سے دونوں فارم دماغ تک پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ابن الہیثم ان حقائق ابصار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''رطوبت جلید یہ کے پاس جو احساس واقع ہوتا ہے وہ عصب اجوف (Excavated Nerve) میں منتقل ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے مقدم دماغ (Cerebrum) کو جاتا ہے اور یہ احساس کا آخری مقام ہے۔آخری عضو حساس وہ قوت نفسانیہ ہے جو مقدم دماغ میں ہوتی ہے اور یہی وہ قوت ہے جو محسوسات کا ادراک کرتی ہے۔آنکھ اس قوت کے ایک آلہ

کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنکھ کا کام صرف اتنا ہے کہ جو صورتیں (فارم) اسے حاصل ہوں ان کو قبول کرے اور اسے آخری عضو حساس تک پہنچا دے جو صورتوں اور اشیائے مرئی کے معانی کا ادراک کرتا ہے۔ رطوبت جلیدیہ کی سطح پر جو صورتیں حاصل ہوتی ہیں وہ سطح جلیدیہ میں پھیل کر جسم لطیف یعنی تجویف عصب میں چلی جاتی ہیں اور یہاں سے عصب مشترکہ میں پہنچتی ہیں اور اس مقام پر ابصار مکمل ہوجاتا ہے''۔(٦٣)

شے مرئی کے دو فارم جو دونوں آنکھوں سے حاصل ہوتے ہیں، دماغ میں پہنچ کر کس طرح ایک ہوجاتے ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے ابن الہیثم لکھتا ہے:

''آخری عضو حساس تک صورت کا امتداد اعصاب کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہیئت چشم کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ دماغ سے جو دو اعصاب نکل کر دونوں آنکھوں تک جاتے ہیں وہ مقدم دماغ کے پاس ملتے ہیں اور عصب واحد میں تبدیل ہوجاتے ہیں پھر جدا ہوتے ہیں اور دونوں آنکھوں میں جا کر ختم ہوتے ہیں۔ دونوں آنکھوں سے واحد شے مرئی سے حاصل شدہ دونوں فارم (صورتیں) دونوں اعصاب (اعصاب بصری) کی تجویف کی راہ آگے بڑھتے ہیں اور ان اعصاب کے مقام اتصال پر ملاقی ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ عصب مشترکہ کی تجویف میں منتہی ہوتے ہیں اور اس مقام پر دونوں فارم ایک ہوجاتے ہیں (٦٤) اور اس واحد فارم سے جو عصب مشترکہ میں وصول ہوتا ہے، آخری عضو حساس شے مرئی کے فارم کا ادراک کرلیتا ہے''۔(٦٥)

گزشتہ صفحات میں علم مناظر و مرایا سے متعلق ابن الہیثم کی جن بلند پایہ علمی تحقیقات کا ذکر کیا گیا اس سے بالکل واضح ہوگیا کہ وہ ایک عظیم ماہر طبیعیات تھا اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس شعبۂ علم میں جدید سائنس نے جو حیرت انگیز پیش رفت کی ہے وہ فی الواقع ابن الہیثم کی علمی مساعی کی مرہون منت ہے۔

مآخذ وحواشی

(۳۲) الحسن بن الہیثم، ج ۱، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔ (۳۳) ایضاً، ص ۱۴۱۔ (۳۴) ایضاً۔ (۳۵) ایضاً۔ (۳۶) ایضاً،

ص۱۴۳۔(۳۷)ایضاً۔(۳۸)تنقیح المناظر، ج۱،ص۶۔(۳۹)ایضاً۔(۴۰)دی انٹلکچو ل ڈیولپمنٹ آف یورپ، جان ولیم ڈریپر، مطبوعہ لندن ۱۸۶۴ء، ج۲،ص۴۴، ۴۵۔(۴۱)انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس، ج۱،ص۷۲۱۔(۴۲)دی انٹلکچو ل ڈیولپمنٹ آف یورپ، ج۲،ص۴۴، ۴۵۔(۴۳)اگر آپ کسی اندھیرے کمرے میں ایک سوراخ کردیں جس سے روشنی کا گزر ہوتو دیوار پر اس کا عکس پڑے گا اور اس عکس میں بیرونی اشیاء کی تصاویر الٹی نظر آئیں گی، اسی کو کیمرہ ابسکیورا کہتے ہیں۔(۴۴)انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس، ج۱،ص۷۲۱۔(۴۵)لیگیسی آف اسلام، سرتھومس آرنلڈ والفریڈ، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۱ء،ص ۳۳۵۔(۴۶)الحسن بن الہیثم، ج۱،ص۵۲۔(۴۷)ایضاً۔(۴۸)ایضاً،ص ۵۵۔(۴۹)اقلیدس ۳۰۰قبل مسیح کا ایک اسکندری عالم تھا۔ اس نے علم مناظر پر جو مشہور کتاب لکھی اس کا نام ''کتاب المناظر'' یا ''کتاب اختلاف المناظر'' ہے۔ بطلیموس دوسو بعد مسیح کا عالم تھا۔ اس کی شہرۂ آفاق کتاب کا نام ''المجسطی'' (Almagesty) ہے۔(۵۰)الحسن بن الہیثم، ج۱،ص۹۔(۵۱)کتاب المناظر، ابن الہیثم، المقالة الاولی، الفصل السادس، فی کیفیة الابصار طبع کویت ۱۹۸۳،ص۱۵۸۔(۵۲)ایضاً، المقالة الاولی، الفصل الثانی فی بحث عن خواص البصر ،ص ۶۳، ۶۴، الفصل السادس فی کیفیة الابصار ،ص۵۶۔(۵۳)ایضاً، المقالة الاولی، الفصل السادس، فی کیفیة الابصار ،ص۶۶۔ (۵۴)کتاب المناظر، المقالة الاولی، الفصل السادس، فی کیفیة الابصار ،ص۱۵۴۔(۵۵) دی انٹلکچو ل ڈیولپمنٹ آف یورپ، ج۲،ص۴۴۔(۵۶)کتاب المناظر، المقالة الاولی، الفصل الخامس فی ہیئة البصر ،ص۱۲۷۔۱۳۶۔(۵۷)ایضاً، المقالة الاولی، الفصل السادس فی کیفیة الابصار ،ص۱۴۳۔(۵۸)ایضاً،ص ۱۴۶، ۱۴۷۔(۵۹)رطوبت بیضیہ (Albumineous Humour) جو شفافیت میں رطوبت جلیدیہ سے مختلف ہے، اس صورت (فارم) کی انفرادیت (Integrity) کو محفوظ رکھتی ہے جو رطوبت جلیدیہ کے مقام اتصال پر اسے حاصل ہوتی ہے۔(۶۰)کتاب المناظر، المقالة الاولی، الفصل السادس فی کیفیة الابصار ،ص۱۴۰، ۱۴۱۔(۶۱)ایضاً،ص ۱۶۱۔ (۶۲)اب ابصار کی تشریح میں فارم کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔(۶۳)کتاب المناظر، المقالة الاولی، الفصل السادس فی کیفیة الابصار ،ص۱۶۳۔(۶۴)ایضاً،ص ۱۶۶۔(۶۵)ایضاً،ص ۱۶۹۔

اصول المقصود

مشائخ سلسلہ قلندریہ کے حوالے سے

انیسویں صدی عیسوی کا ایک اہم فارسی تذکرہ

ڈاکٹر حافظ شبیب انور علوی٭

اودھ کے جو قصبات اپنی تہذیبی و ثقافتی اور علمی و ادبی نیز روحانی روایات کے سرچشمہ رہے ہیں ان میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کو ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ یہاں کے قلندری بزرگوں نے تصوف اور روحانیت کے فروغ، پیام انسانیت کی اشاعت اور صالح روایات کی تشکیل و ترویج میں بڑا اہم اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے تذکرہ و تاریخ، مکتوباتی و ملفوظاتی ادب میں بھی گراں قدر اضافے کیے ہیں۔

زیر نظر تذکرہ اس باب میں اہم ہے کہ اس کے مولف شاہ تراب علی قلندر تراب کاکوروی (۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء تا ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) فارسی و اردو اور اودھی زبان کے نغز گو اور صاحب دیوان شاعر، صاحب طرز ادیب، متدین صوفی، شریعت اور طریقت کے جامع اور صاحب حال بزرگ تھے۔

یہ ضخیم تذکرہ ۵۳۶ صفحات پر مشتمل متوسط تقطیع میں ہے۔ اس کا آغاز انہوں نے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں کیا تھا۔ اس تذکرے میں ۱۲ اصل ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

اصل اول: سلسلۂ قلندریہ کے بانی شیخ عبدالعزیز مکی معروف بہ عبداللہ علم بردار قلندرؒ کے احوال و آثار۔

اصل دوم: سید خضر رومی قلندر کے احوال۔

اصل سوم: سید نجم الدین غوث الدہر قلندر (م ۱۸/رجب ۷۵۰ھ/۲/اکتوبر ۱۳۹۴ء جمعہ)۔

٭خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری ضلع لکھنؤ۔

اصل چہارم: شیخ قطب الدین بینا دل قلندر جونپوری (۲۵/شعبان ۹۲۵ھ/۲۱/اگست ۱۵۱۹ء)۔

اصل پنجم: شیخ محمد قطب قلندر جونپوری (۹/ذی قعدہ ۹۳۰ھ/۸/ستمبر ۱۵۲۴ء)۔

اصل ششم: شیخ محمد عبدالسلام قلندر جونپوری (۱۵/ذی قعدہ ۹۷۶ھ/۲۲/اپریل ۱۵۶۹ء)۔

اصل ہفتم: شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری (۱۲/شوال ۱۰۵۲ھ/۳/جنوری ۱۶۴۳ء)۔

اصل ہشتم: شاہ مجتبیٰ معروف بہ شاہ مجا قلندر لاہرپوری (۱۵/ربیع الثانی ۱۰۸۴ھ/۲۹/جولائی ۱۶۷۳ء)۔

اصل نہم: شاہ فتح قلندر جونپوری (۲۲/شعبان ۱۱۱۸ھ/۲۸/نومبر ۱۷۰۶ء)۔

اصل دہم: شاہ الہدیہ احمد قلندر لاہرپوری (۲۲/ذی الحجہ ۱۱۴۷ھ/۱۵/مئی ۱۷۳۵ء)۔

اصل یازدہم: سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی (۱۷/ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ/۲۳/نومبر ۱۷۸۲ء)۔

اصل دوازدہم: شاہ محمد کاظم قلندر علوی بانی خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری (۲۰/ربیع الثانی ۱۲۲۱ھ/۷/جولائی ۱۸۰۶ء)

اور حضرت مولف کے والد ماجد کا مبسوط و مفصل تذکرہ ہے۔ابتدا میں انیس صفحات پر مشتمل مقدمہ میں مولف نے تمہید کے بعد ''قلندر'' اور اس کے مقام کی جامع تعریف، متقدمین بزرگوں کے اس سلسلہ میں اقوال اور مقام قلندریت پر فائز بعض اکابر کے اسماء بھی درج کیے ہیں۔

کتاب کی وجہ تالیف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایں ہیچ مداں خاکپائے قلندراں رابعد از وفات حضرت والد بزرگوار درسرشد کہ اندکے از سر قلندرانِ نامدار ونُبذی از حالات والد بزرگوار خود بنگارد تا فرزندان و طالبان را سبب یادگاری وخبرداری باشد۔اما ظہور ایں داعیہ بسبب سستی عزم وہم انتظاری استخارہ و اجازت از روحانیت والد بزرگوار در توقف بود۔بعد مدتی در ماہ شعبان ۱۲۲۵ھ قدری از حال والد بزرگوار بنگارد''۔(ص ۵)

حضرت مولف نے مقدمہ میں بھی جہاں قلندر اور صوفی کا ذکر کیا ہے بڑی سختی سے شریعت ظاہری کی پابندی پر زور دیا ہے کہ ''بہ ورزش شریعت صوفی شود ہر کہ صوفی ست قدم از

دائرۂ متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیرون نخواہد نہاد“۔

بود مرد آں کہ در حال تمامی کند با خواجگی کار غلامی

والحال اگر کسی خلاف شرعی کند و گوید کہ من قلندرم۔ باید گفت کہ تو ملحدی و قلندر نہ بلکہ حشویہ مذہبی“۔ (ص ۱۰) سرگروہ قلندراں شیخ عبدالعزیز مکی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور اصحاب صفہ میں ہونے اور ان کی درازی عمر کے سلسلے میں مدلل گفتگو فرمائی ہے۔ بعد ازاں حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے ہمراہ جنگ جمل و صفین میں شرکت حضرت علیؓ سے تعلیم و تلقین کی تکمیل اور ان سے بیعت کا ذکر ہے۔

دوسری اصل حضرت امیر سید خضر رومی قلندر سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے ظاہری و باطنی کمالات، غیر معمولی تصرف کے حال میں متعدد واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً سلطان محمد تغلق کی ان کی بارگاہ میں نہایت نیاز مندانہ و مودبانہ حاضری، خطیر رقم بہ صورت اشرفی پیش کرنا اور آپ کا ان کو ہاتھ بھی نہ لگانا وغیرہ مستند حوالوں سے نقل فرمایا ہے۔

اس قسم کے واقعات سے اس دور کے مشائخ و صوفیہ کا ارباب حکومت اور صاحبان اقتدار کے متعلق رویہ، ان کا استغنا، جرأت اور حق پرستی کا پتہ چلتا ہے۔

تیسری اصل (۴۲ تا ۵۸ صفحات) سید نجم الدین غوث الدہر قلندر ابن سید نظام الدین غزنوی ابن سید نورالدین مبارک غزنوی دہلوی (م ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) کے تذکرے سے متعلق ہے۔ آپ کے جد امجد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے بھانجے تھے۔ سلطان شہاب الدین غوری کی دہلی پر فتح یابی شیخ سہروردی کی دعا و توجہ اور آپ کے جد امجد (سید نورالدین مبارک غزنوی) کی اس کے ساتھ ہمراہی کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی تھی۔ ان کے ارشادات نہایت بلیغ ہیں:

اَلتَّصوفُ ترکُ کُلِّ حَظِّ النَّفس۔ تمام حظوظِ نفسانی کے چھوڑ دینے کو تصوف کہتے ہیں۔

اَلاِیْمَانُ اِستِیْنَارُنَارالْھُوِیَۃِ فِی الْقَلْب۔ ایمان دل میں ہویت کی آگ سُلگانے کا نام ہے۔

چوتھی اصل (۵۹ تا ۷۴ صفحات) شیخ قطب الدین بینا دل قلندر فاروقی جونپوری کے احوال و کوائف میں ہے جو سید نجم الدین غوث الدہر قلندر کے خلیفہ ہیں۔ اس میں ان کے خاندان، باطنی کمالات اور ان سے جاری شدہ سلاسل کا بھی بیان ہے۔

پانچویں اصل شیخ قطب الدین بینا دل قلندر کے بڑے صاحبزادے اور خلیفۂ اکبر شیخ محمد قطب قلندر اور چھٹی اصل (۵۷ تا ۷۹ صفحات) ان کے بڑے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ عبدالسلام قلندر نیز ساتویں اصل (۷۹ تا ۸۶) ان کے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ عبدالقدوس قلندر کے تذکرے پر مبنی ہے۔ان حضرات کے احوال و آثار کے ذکر کے بعد ان کے خلفاء و مجاز حضرات کے اسماء بھی درج فرمائے ہیں۔

آٹھویں اصل (۸۷ تا ۱۰۱ صفحات) شیخ عبدالقدوس قلندر قدس سرہ کے خلیفۂ اکبر شاہ مجتبیٰ عرف شاہ مجا قلندر لاہر پوری سے متعلق ہے۔اس میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت عباس عم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک درج کرنے کے بعد ان کے ظاہری اور باطنی کمالات اور نامور خلفاء کا ذکر ہے۔

نویں اصل (۱۰۱ تا ۱۱۴) حضرت شاہ فتح قلندر جونپوری (جو حضرت قطب الدین بینا دل جونپوری کے نامور اور باکمال اخلاف میں تھے) کے تذکرے سے متعلق ہے۔موصوف شاہ مجا قلندر لاہر پوری کے خلیفۂ اکبر تھے۔شہزادہ داراشکوہ ان کے بہت معتقد و معترف تھے۔انھوں نے حضرت سے تصوف اور سلوک سے متعلق دقیق سوالات کیے، جن کے آپ نے کافی وشافی جوابات دیے۔ان کے چار ہزار سے زائد باکمال و صاحب حال و تصرف مریدین تھے۔حضرت مولف نے ان کے اخلاف اور بعض نامور مریدین اور خلفاء کے اسماء بھی تحریر کیے ہیں۔

دسویں اصل (۱۱۴ تا ۱۲۶ صفحات) شیخ علاء الدین عرف شاہ الھدیہ احمد قلندر قدس سرہ کے تذکرے سے متعلق ہے۔موصوف شاہ مجا قلندر لاہر پوری کے بھائی شاہ یٰسین قلندر کے صاحبزادے تھے۔ان کے تینوں صاحب زادوں کے علاوہ فیض صحبت سے بڑے بڑے باکمال اور صاحبان تصرف اور اعلیٰ استعداد خلفاء بھی ہوئے۔

گیارہویں اصل (۱۲۶ تا ۱۹۲ صفحات) میں سید شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی کا تفصیلی تذکرہ ہے۔اس میں ان کے احوال و کوائف تصرفات و کرامات ان کے بھائی، اولاد اور خلفاء و مجاز وغیرہ کا ذکر معاصر اور مستند مآخذ کی مدد سے قلم بند فرمایا ہے۔

بارہویں اور آخری اصل (۱۹۲ تا ۵۳۰ صفحات) اپنے والد ماجد شاہ محمد کاظم قلندر بانی

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری کے مفصل اور جامع تذکرے پر مشتمل ہے۔ اصول المقصود دراصل شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ کے مکمل تذکرہ وسوانح کا سب سے مستند، مفصل اور اولین فارسی مآخذ ہے۔ جس میں شاہ صاحب کی ولادت، خاندان، اخلاق وفطری اوصاف، علم ظاہری کی تحصیل و تکمیل، علم موسیقی کا اکتساب، شجاع الدولہ کی فوج میں ملازمت، شاہ مظہر حسینؒ سے ملاقات، شیخ کامل کی تلاش بکسر کی جنگ سے قبل ہی بغیر کسی کو اطلاع دیے علاحدگی، شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی کا غائبانہ ذکر سن کر راتوں رات ان کی خدمت میں گورکھپور سے پاپیادہ سفر، دمگڈھ، الہ آباد ان کی خدمت میں حاضری، ان کو اس آمد کی خبر کشف سے ہونا اور بہت پہلے سے ہی استقبال کی تیاری، ان کے فراق میں ان کی والدہ ماجدہ کا بے قرار ہونا، سلوک کی ابتدا میں شیخ کی یک گونہ بے التفاتی، بیعت کے بعد شیخ کے حکم پر والدہ ماجدہ کی خدمت میں کاکوری حاضر رہنا، قبض وبسط کی کیفیات، دس سال کی محنت وسخت ریاضت ومجاہدہ کے بعد شیخ کا تمام سلاسل کی اجازت وخلافت کبریٰ اور لباس فقر عطا فرمانا اور ان کے حق میں بشارتیں دینا، بحکم شیخ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا، ابتدائے حال توحید کا غلبہ، بہت سے درویشوں کا آپ کے مقام وحال کی خبر اور بشارات دینا، پیر ومرشد قدس سرہ کی بارگاہ میں مقبولیت ومحبوبیت، ہر سال کاکوری سے پاپیادہ ان کی خدمت میں حاضری اور تعلیم وتربیت نیز اذکار واشغال کی مشق، واردات وکیفیات، احباب ومریدین ومسترشدین کی تعلیم وتربیت کا طریقہ، صاحبزادگان کی تربیت وتہذیب نفس کی غیر معمولی نگہداشت، مہاراجہ ٹکیت رائے بہادر وزیر نواب آصف الدولہ بہادر کی آمد ورفت، حضرت کی بارگاہ میں نیازمندی وعقیدت، مدد معاش کے لیے گاؤں کی معافی کا پروانہ نذر کرنا، شان استغنا، مہاراجہ سے یہ تحریری ارشاد کہ ''ہم نے اللہ پر توکل کر کے فقیری اختیار کی ہے نہ کہ تمہارے بھروسہ پر'' وغیرہ وغیرہ۔ پھر بیماری اور مرض الوفات، وفات کی تاریخیں اور قطعات، تمام سلاسل طریقت، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت، کشف وکرامات، وصال کے بعد کرامات اور تصرفات کا صادر ہونا، بھائی شاہ میر محمد قلندر (حسان الہند علامہ محسن کاکوروی کے دادا) کا حال، آنجناب کے ان کے نام مکتوبات نیز شاہ حمایت علی قلندر، شاہ بہرام علی قلندر، شاہ عاشق اللہ، شاہ انشاء اللہ، شاہ شیر علی، شیخ طفیل علی فوجدار شاہی، ملا قدرت اللہ بلگرامی، شاہ امید علی جونپوری،

شیخ فضل اللہ نیوتنوی، شیخ صاحب علی، شاہ محمد محفوظ اور محبّ علی خاں زمیندار لگرہ ملیح آباد وغیرہ کے تذکرے ہیں۔

بعدازاں عبادات وریاضات، ہر ماہ کے چاند دیکھنے پر نمازیں، ہر ہفتہ کی نمازیں اور ہر ہفتے کی راتوں کی نمازوں کا بیان ہے۔

آخر میں شیخ احمد حسین، شیخ شفاعت علی علوی، امید علی کسمنڈوی، شیخ ہدایت اللہ بدلی خیاط، شیر علی خاں، شیخ دین محمد، بی بی عبرت، بی بی سبحانی، بخشی رفعت اللہ خاں عباسی نصرت جنگ کی صاحبزادی صاحبہ وغیرہ کے تذکرے ہیں۔

''اصول المقصود'' فارسی تذکروں اور ملفوظات کے باب میں ایک تالیف ہے۔

یہ تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے صاحب نظر مولف نے بعض ان نادر و نایاب مخطوطات کے حوالے اور نثری و منظوم اقتباسات دیے ہیں جو آج ناپید ہوچکے ہیں۔ اس لیے بیشتر صاحبان کے ذکر میں یہ تذکرہ اولین اہم ماخذ ہے۔ اس سے اس دور کے تہذیبی وثقافتی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے، فقراء ومشائخ کی ارباب دولت وثروت سے استغناء، مذہبی رواداری، باہمی میل جول وغیرہ کے متعدد واقعات مذکور ہیں، شیخ ومرید کے قلبی ارتباط، تعلق خاطر اور اس دور کے خداطلبی وخداپرستی کے عام رجحان کا بھی علم ہوتا ہے۔

بزم صوفیہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

اس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحب تصنیف اکابر صوفیہ شیخ ابوالحسن علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حمیدالدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی، خواجہ فریدالدین گنج شکر، فخرالدین عراقی، شیخ امیر حسینی، خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ بوعلی قلندر وغیرہ کے حالات وتعلیمات وارشادات کی تفصیل، ان کے ملفوظات اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

قیمت =/۳۰۰

جامعہ باقیات صالحات، ویلور اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے روابط تاریخ کے آئینہ میں

ڈاکٹر راہی فدائی

جنوبی ہندوستان کا وہ ساحلی علاقہ جو کورمانڈل (تمل ناڈو) سے نلّور (آندھرا) تک پھیلا ہوا ہے، قدیم دور میں ''معبر'' کہلاتا تھا، جس پر ''پانڈیا'' خاندان کے متعدد راجاؤں نے حکومت کی تھی، انہوں نے شہر ''مدورا'' (Madurai) کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا، جب دہلی کے تخت و تاج کے وارث سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ تا ۷۱۶ھ) کے نامور سپہ سالار ''ملک کافور'' نے ۷۱۰ھ مطابق ۱۳۱۰ء میں مدورا کو فتح کرلیا اور راجا سندر پانڈیا کو باج گزار بنا کر سلطان ہند کا مطیع وفرماں بردار بنادیا، اس وقت اس نے ''رامیشورم'' میں مسجد بنائی اور علاء الدین کا خطبہ پڑھا، بعد ازاں سلطان محمد تغلق (م ۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء) کے آخری دور میں مدورا پر مسلمانوں کی خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں، چنانچہ سلطان احسن شاہ سے سلطان علاء الدین تک (۷۳۵ھ تا ۷۸۰ھ) مکمل پینتالیس سال معبر مسلم حکمرانوں کے زیر اقتدار رہا جہاں مندروں کے ہمدوش مساجد، مدارس اور خانقاہوں کی جلوہ نمائی اس جنوب بعید کے منظر نامہ کی آنکھوں کو خیرہ کردیتی تھی، شہر کے آراستہ بازاروں، قریوں کے چوپالوں اور قصبوں کے کھیل کود کے میدانوں میں بھی اسلامی شعار وانسانی وقار کے نمونے جابجا دیدہ ودل کی کشش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ نصف صدی بھی ہونے نہ پائی کہ ''ویجانگر'' کے راجا بکارایا دوم نے ۷۸۰ھ مطابق ۱۳۷۸ء میں تمام معبر کو اپنے قبضہ میں کرلیا

بنگلور۔

جس سے سلاطین معبر کا اقتدار قصہ پارینہ بن گیا،اس کے بعد رفتہ رفتہ مدورا اوران کے اطراف و اکناف سے مسلمانوں کے آثار مٹا دیے گئے اس طرح آخر کار شعائر اسلام پامال ہونے لگے،اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں آباد مسلمان غیروں کے رسم ورواج کے عادی ہوگئے،اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ مدورا کے راجاؤں نے اس قدر بت کدے تعمیر کیے کہ وہ شہر مندروں کے حوالے سے یاد کیا جانے لگا۔ادھر عام مسلمانوں میں بدعات وخرافات کا چلن بڑھ گیا اور معاشرے میں رسوم کی کثرت ہونے لگی، جب ایک مدت تک یہی افسوس ناک و مایوس کن کیفیت طاری رہی تو رحمت خداوندی کو اس پر ترس آیا، چنانچہ حکمت الٰہی نے قوم کی اصلاح اور ملت کی صلاح وفلاح کے لیے اواخر گیارہویں صدی میں ایک خدارسیدہ بزرگ مصلح وداعی کو اس سرزمین کے لیے منتخب فرمایا جنہوں نے پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ بدعتوں کا قلع قمع کرنے کا عزم کیا اور سنتوں کو از سر نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا،انہیں کی داعیانہ سرگرمیوں اور مصلحانہ کوششوں کی تاثیر ہے کہ صدیوں سے معبر میں مسلمان عزت واحترام کی زندگی گزار رہے ہیں۔اس عظیم داعی کا نام نامی واسم گرامی حضرت شاہ مدار قدس سرہ ہے،حضرت شاہ مدارؒ کے جداعلیٰ اشارۂ غیبی کے تحت عرب کی سرزمین سے نکل کر سمندر کے راستے سے بھٹکل پہنچے پھر وہاں سے کاروار میں آکر قیام پذیر ہوگئے (۱)۔شاہ مدار کی تیسری پشت میں شیخ الشیوخ حضرت مولانا حافظ قاری عبدالقادر قادری آتوری قدس سرہ (۱۱۹۸ھ۔۱۲۵۱ھ) ابن حضرت مولانا شاہ غلام محی الدین آتوریؒ (م۱۲۲۰ھ) کی حیثیت مجمع البحرین کی تھی،وہ بیک وقت بلند پایہ عالم اوراعلیٰ مرتبت صوفی تھے،انہوں نے اپنے والد ماجد کے علاوہ کیلا کرے (تمل ناڈو) کے صاحب حال وقال مقدس شخصیت علامہ شیخ عبدالقادر تکیہ صاحب (۱۱۹۲ھ۔۱۲۶۷ء) اور مدارس کے استاذ العلماء قاضی ارتضٰی علی خان فاروقیؒ (م۱۲۷۰ھ) سے علوم وفنون کی تکمیل کی اور خانوادۂ اقطاب ویلور کے صاحب کشف وکرامت بزرگ حضرت سید شاہ ابوالحسن محوی قادری ویلوریؒ (۱۱۸۶ھ۔۱۲۴۳ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر منازل سلوک طے کیے،جس سے ان کا شمار حضرت محوی کے ممتاز خلفاء میں ہونے لگا،شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۴۹ھ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م۱۲۳۹ھ) کی فارسی تفسیر کا عربی ترجمہ **"التعریب القادری علی التفسیر العزیزی"** کے نام سے کیا،راقم نے ایک جگہ لکھا کہ:

"غالباً یہ عربی کا اولین ترجمہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا (شاہ عبدالقادر کا) مطالعہ نہ صرف کافی وسیع تھا بلکہ شمالی ہند میں منظر عام پر آنے والی تحریروں اور وہاں رونما ہونے والی تحریکوں سے بھی آپ بخوبی واقف تھے، آپ کا منشا تھا کہ جنوبی ہند کے وہ اہل علم جو فارسی سے کماحقہ واقف نہیں ہیں اور عربی پر دسترس رکھتے ہیں، انہیں شاہ عبدالعزیز کے تفسیری افادات سے آگاہ ہونے کا موقع فراہم کیا جائے، آپ کو شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی، شاید اسی لیے آپ نے اپنے دوسرے فرزند کا نام شاہ صاحب کے نام کی مناسبت سے "عبدالعزیز" رکھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ شاہ صاحب سے آپ کے مراسم رہے ہوں اور انہیں کی ایما پر تاخیر سے سہی عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہو۔ بہرحال حضرت شاہ عبدالقادر قادری کی شخصیت شمال و جنوب کے درمیان علمی روابط اور فکری مناسبت کے زریں سلسلہ کی ایک مضبوط کڑی کی حیثیت رکھتی ہے"۔(۴)

شاہ عبدالقادر آتوریؒ کے فرزند ارجمند و خلف رشید شمس العلماء اعلیٰ حضرت قاری شاہ عبدالوہاب قادریؒ (۱۲۴۸ھ۔۱۳۳۷ھ) نے اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جنوب وشمال کے مشاہیر اہل علم و فضل اور اکابر اصحاب شرع وورع سے خوب استفادہ کیا، چنانچہ ان کے من جملہ اساتذہ میں علامہ حکیم زین العابدین مائل ویلوری (۱۲۱۴ھ۔۱۲۹۷ھ)، علامہ رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۳۳ھ۔۱۳۰۸ھ)، علامہ غلام قادری مدراسی (م۱۲۹۳ھ) قابل ذکر ہیں، اسی طرح شیوخ کرام میں قدوۃ السالکین حضرت علامہ سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی معروف بہ قطب ویلور (۱۲۰۷ھ۔۱۲۸۹ھ) ، امام العارفین حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی (۱۲۳۳ھ۔۱۳۱۷ھ) اور قیوم دوراں حضرت فضل رحمٰن نقش بندی گنج مرادآبادی (۱۲۰۸ھ۔۱۳۱۳ھ) کے اسمائے گرامی خصوصیت کے حامل ہیں۔ اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری نے اس شدید احساس کے تحت کہ اس دور ابتلا میں مسلمانوں کو ان کی گمرہی و بے راہ روی سے بچاکر صراط مستقیم پر چلانے، انہیں درماندگی و زبوں حالی کی گہری کھائی سے نکالنے اور ان میں موجود کیفیت مایوسی و احساس کمتری کو

دور کرنے کے لیے اعلیٰ و معیاری دینی تعلیمی و تربیت کے مرکز کی اشد ضرورت ہے، شہر ویلور (تمل ناڈو) میں ہندوستان کے اولین مدرسہ کی بنیاد ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں رکھی جو آگے چل کرام المدراس مدرسۂ باقیات صالحات کے نام سے نہ صرف ہندوستان بھر میں مشہور ہوا بلکہ چین، ویتنام، انڈونیشیا، ملیشیا، سری لنکا وغیرہ جنوب بعید کے ممالک میں بھی اس کا فیضان جاری رہا، اعلیٰ حضرت بانی علیہ الرحمہ نے اپنے سفر حج بیت اللہ اور قیام مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۴ھ تا ۱۲۸۶ھ کے دوران حرم شریف کے متعدد شیوخ و جید اساتذہ کے علاوہ مولانا محدث سید حسین پشاوری، مفتی حرم شیخ احمد حلان شافعی اور علامہ ملا محمد نواب ہندی سے بھی حدیث شریف و دیگر علوم وفنون میں اکتساب فیض کیا۔ مزید براں حضرت قطب ویلور نے اپنے چہیتے مرید شاہ عبدالوہاب کو ۱۲۸۱ھ میں ''وہاب الخیر'' کا لقب عطا کرتے ہوئے خرقہ خلافت پہنایا جبکہ ان کی عمر ابھی ۳۳ سال تھی، علاوہ ازیں علوم معارف میں تحریر کردہ اپنی معرکہ آرا دونوں تصانیف ''جواہر السلوک'' اور ''جواہر الحقائق'' کی تلقین کرنے کے ساتھ ان کتابوں کی طباعت کا ذمہ بھی انہیں کو تفویض فرمایا (۳)۔ اس پر نور علیٰ نور یہ کہ اس انتہائی مسرت خیز واقعہ کے ٹھیک چار سال بعد مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکی نے بھی اپنے فیوض و برکات سے انہیں نوازا اور ۱۲۸۵ھ میں اپنا خلیفۂ خاص و مجاز بیعت نامزد فرمایا اور پھر ایک مدت کے بعد جب اعلیٰ حضرت بانی باقیات اپنے مدرسہ کے اولین جلسۂ دستار بندی منعقدہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء سے تقریباً ایک سال پیشتر شمالی ہند کا دورہ کیا اور وہاں کے اکابر علما وفضلا سے تبادلۂ خیال فرمایا تو اس سفر کا خلاصہ اور اس طویل مسافت کا حاصل قطب ارشاد حضرت فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں باریابی تھی جس میں حضرت قطب ارشاد نے ان کو سلسلۂ نقش بندیہ میں اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا اور ان کی استدعا پر مدرسۂ باقیات صالحات کی ترقی و توسیع کے لیے دعاؤں سے نوازا۔ اس اہم واقعہ کو منظوم کرتے ہوئے ان کے عقیدت مند تلمیذ مولانا محمد اعظم سفیر بلنج پوری نے کہا ؎

جب سوئے ہند بہر ضرورت ہوئے رواں　　جو اہل فضل نامی تھے، سب سے ملے وہاں
مولانا فضل رحمٰن ولی ایک تھے جہاں　　پائے ہیں فیض ان سے بھی جا کر وہ بے کراں
خلوت میں ان کے آپ وہاں ہو کے کامیاب　　یاں طالبان حق کو کیے ہیں وہ فیض یاب

وقت وداع آپ نے کی عرض مرشدی کچھ میرے مدرسہ کو دعا کیجیے ولی
تب کی دعا ولی نے کہ یا قادر و غنی وہ مدرسہ ہو اوج ترقی پہ ہر گھڑی
جیسی دعا وہ مانگے بدرگاہ ذوالجلال ویسا ہی مدرسہ کو ملا درجۂ کمال (۴)

اس مقام پر یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ قبل ازیں اعلیٰ حضرت دو بزرگ و برتر شخصیتوں سے مستفیض ہو چکے تھے تاہم علم و عرفان کے حصول کی تڑپ نے ان کو چھپّن سالہ پختہ عمر میں بھی استفادہ سے باز نہیں رکھا۔ اور شیخ نے چھیانوے سال کی بڑی عمر میں فطری مجبوری و انتہائی کمزوری کے باوجود افادے اور فیض رسانی سے صرف نظر نہیں فرمایا۔

''اعلیٰ حضرت بانی باقیات صالحات کی طرح قیوم دوراں حضرت شیخ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیری (۱۲۶۲ھ۔۱۳۴۶ھ) نے بھی خوب فیض پایا تھا، اکتیس سال کی عمر میں حضرت شیخ سے سلسلۂ نقش بندیہ میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے تھے، اس وقت حضرت شیخ کی عمر پچاسی سال تھی، حضرت شیخ ان کو بہت چاہتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''یہ ہمارا لڑکا ہے'' (۵)، مرشد کی چاہت و محبت کے متعلق خود مولانا مونگیری کا بیان ہے کہ ''مکرر خادم سے فرمایا ''پان لاؤ، وہ پان لایا، آپ (حضرت فضل رحمٰن) نے اسے لے کر اپنے منہ مبارک میں لیا اور کسی قدر اسے چبا کر مجھے عنایت فرمایا اور زبان فیض ترجمان سے یہ لفظ بھی ارشاد ہوئے کہ ''لو یہ پان ہے عرفان کا، اسے کھالو'' یہ دونوں باتیں معمول کے خلاف تھیں'' (۶)، حضرت شیخ سے وابستگی اور روابط سے پیشتر مولانا مونگیری نے حضرت مولانا شاہ کرامت علی قدس سرہ کی صحبت میں وقت گزارا تھا اور اٹھارہ برس کی نوجوانی ہی میں سلسلہ قادریہ میں مشرف بہ بیعت وخلافت ہوئے تھے، اسی لیے مولانا مونگیریؒ نے حضرت شیخ فضل رحمٰن کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جو کوئی تمہارے پاس آکر بیعت کی درخواست کرے تو خاندان نقش بندیہ اور قادریہ میں مرید کرلیا کرو''۔(۷)

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بانی مدرسہ باقیات صالحات ویلور اور بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دونوں بزرگ ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے دو ثمر آور مقدس شاخیں ہیں۔ علاوہ ازیں ان دونوں حضرات کی فکری اساس اور ذہنی ساخت بھی متحد تھی، مسائل

علمیہ اور معاملات دینیہ میں افراط وتفریط سے پرہیز کرتے ہوئے راہ اعتدال پر گامزن رہنے ہی کو دونوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا، جیسا کہ راقم نے پہلے بھی لکھا:

''اعلیٰ حضرت بانی باقیات کا مسلک دراصل آپ کے اساتذہ کرام و مشائخین عظام کا مسلک رہا ہے اور یہ مسلک ''مسلک اعتدال'' کے نام سے سینکڑوں سالوں سے اہل علم میں معروف اور اہل فضل میں مشہور ہے۔ اس مسلک کے حاملین علمائے کرام نے ہمیشہ فتنہ وفساد سے اپنا دامن بچائے رکھا، افتراق بین المسلمین سے یہ کوسوں دور رہے ہیں، مسلمانوں کی تحقیر وتذلیل ان کا شیوہ نہیں رہا، اسی لیے ان کے یہاں تکفیر کا بازار کبھی نہیں لگا''۔(۸)

حضرت بانی ندوۃ العلماء نے بھی اسی میانہ روی اور اعتدالی روشن کی تعریف وتوصیف فرمائی تھی، چنانچہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے طلبہ واساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا:

''مدرسہ کی خوش نصیبی اور مولانا مرحوم (حضرت رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ) کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمرہ یہ ہے کہ اس کے تمام مدرسین وطلبہ اس وقت کی آفتوں سے علاحدہ ہیں، ان کے خیالات میں نہ افراط وتفریط ہے اور نہ جدال ونزاع کا انہیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر وتفسیق کا انہیں خیال ہے، الحمدللہ اس نازک اور پُرفتن وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے وہ اس مدرسہ پر ہے''۔(۹)

حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیری نے جن اغراض ومقاصد کے تحت تحریک ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی تھی، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا اسحاق جلیس ندوی نے رقم کیا ہے:

''اس تحریک کے پیش نظر ابتدا میں دو مقاصد تھے: ۱-علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔ ۲-رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔ تحریک ندوہ جوں جوں آگے بڑھتی رہی۔ اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی

مقاصد میں اضافہ کیا، اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے:

۱-علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔ ۲-ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع عمل کے ساتھ جدید خیالات سے واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔ ۳-اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔ ۴-اسلامی تعلیمات کی اشاعت، بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرنا''۔(۱۰)

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات کے پیش نظر بھی یہی مقاصد تھے، جس کے تحت ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، جب مدرسۂ باقیات ۱۲۹۲ھ م ۱۸۷۵ء میں مستقل عمارت میں منتقل ہوا تو اس وقت مدرسہ کے نصاب میں انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کی کتابیں شامل کی گئیں جس کا تسلسل تا حال جاری ہے۔ اسی مقصد کا ذکر مولانا سید شاہ ابوالحسن علی ندویؒ (م ۲۰۰۰ء) نے ''حیات عبدالحیٔ'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم وفنون کے ساتھ پڑھایا جائے''۔(۱۱)

اعلیٰ حضرت بانی باقیات کے مذکورہ مقاصد کی تجدید وتوسیع کی خاطر ۷؍جمادی الآخر ۱۳۲۴ھ م ۳۰؍جولائی ۱۹۰۶ء کو مجلس تعلیمی اہل اسلام جنوبی ہند (South Indian Muslim Educational Committee) کا انعقاد عمل میں آیا جس میں اکیس تحریکیں پیش کی گئیں اور منظور ہوئیں، ان میں سے صرف دو تحریکوں کا ذکر نمونتاً پیش کیا جارہا ہے:

''یہ امر نہایت ضروری ہے کہ علمائے اسلام کو انگریزی سیکھنے اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عربی میں ضروری استعداد حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے اور انہیں ان مقاصد کے لیے وظائف دیے جائیں۔ اس تحریک کو مولوی حکیم محمد محی الدین حسین چیدہ (م ۱۳۳۶ھ) صدر مدرس مدرسۂ لطیفیہ، ویلور نے

پیش کیا، جو منظور کر لی گئی‘‘۔

’’گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ گورنمنٹ بورڈ اور منسپل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں، مسلمانوں کو ان کے ذاتی خرچ سے دینی تعلیم دینے کی اجازت دی جائے جیسا کہ ’’گورنمنٹ مدرسۂ اعظم‘‘ مدراس کے لیے دی گئی ہے، یہ تحریک بھی منظور ہوگئی‘‘۔(۱۲)

بعد ازاں ان تحریکوں کو نافذ کرنے کی سعی مشکور کی گئی جو کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔تحریک ندوۃ العلماء کے اجلاس شائزدہم[۱۶] منعقدہ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء مدراس میں مذکورہ دوسری تحریک کے مماثل تحریک مولانا عبدالمجید شرر مدراسی (م ۱۹۳۴ء) مدیر ’’قومی رپورٹ‘‘ نے پیش کی جس کے الفاظ یہ ہیں:

’’ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ تحریک کرتا ہے کہ سرکاری اور امدادی اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا وقت دوران اوقات مقررہ میں معین فرمائے اور موجودہ مذہبی انتظامات میں سہولت عطا فرمائے نیز مشنری درسگاہوں میں مسلمانوں کو انجیل کی تعلیم سے علاحدہ رہنے کا اختیار دے‘‘۔(۱۳)

اس تجویز پر مباحثہ ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ دوبارہ غور وفکر کے لیے استقبالیہ کمیٹی کے حوالے کی جائے ،اس طرح یہ تجویز ملتوی کر دی گئی۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت بانی باقیات کے خلف الصدق حضرت خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد قادری باقوی (۱۸۶۴ء۔۱۹۴۱ء) نے ۱۹۰۱ء میں مدرسہ باقیات کے پہلو میں صنعت وحرفت کا ایک شاندار مدرسہ ’’انجمن اشاعت الحسنات‘‘ کے نام سے جاری فرمایا، جس میں دستکاری کے مختلف شعبے قائم کیے گئے تھے اور فرنیچر سازی کا کام باقاعدہ کیا جاتا تھا، اس انڈسٹریل اسکول کا افتتاح ۳۰/مارچ ۱۹۰۱ء کو مسٹر رچرڈ ہملٹن کیمپل ’’کلکٹر‘‘ شمالی آرکاٹ کے زیر صدارت عمل میں آیا (۱۴)۔اس خوش گوار واقعہ کے تین سال بعد ندوۃ العلماء کا دسواں سہ روزہ اجلاس منعقدہ مدراس ۱۴/شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳/جنوری ۱۹۰۴ء سے شروع ہوا جس میں یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ ’’چونکہ کتابی تعلیم کسب معاش کا ذریعہ نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مدارس عربیہ میں صنعت

وحرفت کی تعلیم داخل کی جائے''۔(۱۵)

مذکورہ بالا تفصیلات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جامعہ باقیات اور دارالعلوم ندوہ کے بانیان و ذمہ داران کی سوچ، تعلیم و تربیت کے بارے میں یکساں تھی اور اسی اتحاد فکر و اتفاق رائے کی وجہ سے باہمی ربط و ضبط اور آپسی صلاح و فلاح کا جذبہ مستحکم تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب ندوۃ العلماء کے دسویں اجلاس کا افتتاح بتاریخ ۱۴؍شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳؍جنوری ۱۹۰۴ء شہر مدراس میں ہوا تو اس کی دامے درمے سخنے تائید کرنے والوں میں اہل باقیات پیش پیش تھے، اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ داعیان اجلاس کی طرف سے ندوہ کی تائید کی درخواست کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت بانی مدرسۂ باقیات اور شمس العلماء سید شاہ محمد رکن الدین قادری (۱۲۶۹ھ۔۱۳۲۵ھ) سجادہ نشین آستانہ اقطاب ویلور کی خدمات عالیہ میں مراسلے روانہ کیے گئے تو دونوں بزرگوں نے اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے ضعف و علالت کی وجہ سے اجلاس میں شرکت سے معذوری ظاہر کی مگر اپنے صاحبزادگان کو روانہ فرمایا، چنانچہ خان بہادر علامہ ضیاء الدین محمد قادری ابن اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات اور حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری مکی ابن شمس العلماء سید شاہ رکن الدین قادری نے بہ نفس نفیس سہ روزہ اجلاس میں شریک رہ کر اپنے زریں مشوروں سے نوازا، خصوصاً علامہ ضیاء الدین محمد نے بڑی مستعدی اور گرم جوشی کا ثبوت دیا اور ۱۷؍شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶؍جنوری ۱۹۰۴ء کو اسپرنگس گارڈن، پیتام پیٹھ، مدراس میں انعقاد پذیر اجلاس چہارم میں نہ صرف شرکت کی بلکہ دارالعلوم ندوہ کی تعلیم قرآن والی عمارت تعمیر کرنے کے لیے علامہ شبلیؒ اور مولانا حقانی کے ہمراہ خاطر خواہ چندہ بھی عنایت فرمایا۔اس اجلاس کی مکمل روداد ۷؍جنوری ۱۹۰۴ء بروز پنج شنبہ مدراس سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار ''نیر آصفی'' میں چھپ چکی ہے(۱۶)۔ان بزرگان ویلور کی شرکت اس لیے کافی اہمیت اختیار کرگئی کہ اس وقت تک اہل ندوہ پر ''توھب'' کا الزام لگا دیا گیا تھا اور مدراس میں ان کی آواز نا قابل التفات سمجھی جارہی تھی۔بقول مصنف تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول اور ''ندوۃ العلماء کی بھی مخالفت شروع ہوئی اور بریلی کے جلسہ سے اس میں برگ و بار پیدا ہونے لگے یہاں تک کہ شرکائے ندوۃ العلماء کی تکفیر کی گئی'' (۱۷)۔اس تحریک کی مخالفت شمال سے نکل کر جنوب میں داخل ہونے تک تناور

درخت کی صورت اختیار کرگئی جس سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول مصنف موصوف:

''دو چار روز اطمینان وسکون کے ساتھ مختلف مقامات پر وعظ و بیان ہوتے رہے مگر اس کے بعد مخالفت میں تیزی شروع ہوئی اور سرعت کے ساتھ شہر واطراف میں پھیل گئی، اس کا احساس اس وقت ہوا جب کہ مخالفین کی جانب سے سنگ باری، فوج داری اور جلسوں کو درہم برہم کرنے کی کارروائی شروع ہوگئی''۔(۱۸)

اس سخت پریشانی اور انتہائی مایوسی کی حالت میں مدراس کے علماء وعمائد کو مخالفت سے باز رکھنے اور انہیں بڑی حد تک ہم خیال کرنے کا بیڑا علامہ ضیاء الدین محمد نے اٹھایا۔ یہ اس لیے کہ اس تحریک ندوہ کے مقاصد نیک تھے جن سے بانی باقیات علیہ الرحمہ کو اتفاق تھا اور اس تحریک کے حاملین میں بانی باقیات اعلیٰ حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری کے پیر بھائی بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیری نقش بندی (م ۱۳۴۶ھ)، حضرت مولانا سید شاہ سلیمان قادری پھلواری (م ۱۳۵۴ھ) اور حضرت مولانا سید شاہ حکیم عبدالحیٔ حسنی (م ۱۳۴۳ھ) جیسے اکابر علماء موجود تھے جن کا اعتبار نا قابل تردید تھا، مزید براں علامہ ضیاء الدین محمد کے شفیق استاذ پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے بانی ندوۃ العلماء بہت متاثر تھے۔ انہیں اسباب کی بنا پر علامہ موصوف اس تحریک سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ ان کے جذبۂ تعاون اور مخلصانہ تائید نے رکن انتظامیہ ندوۃ العلماء کے منصب پر فائز کردیا۔ چنانچہ جب ندوۃ العلماء کے سولہویں اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں شہر کے مقتدر علماء وعمائدین کا اجلاس طلب کیا گیا تو اس کی صدارت کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی گئی۔ مذکورہ اجلاس کی روداد کا خلاصہ مولانا اکرام اللہ خان ندوی کے حوالے سے مصنف تاریخ ندوہ جلد دوم نے اس طرح بیان کیا ہے:

''بتاریخ ۱۴؍نومبر ۱۹۱۶ء بہ مقام لالی ہال، مونٹ روڈ، مدراس ایک عام جلسہ مسلمانان مدراس کا ''انجمن معین الندوہ'' کی طرف سے منعقد ہوا جس میں شہر کے سربرآوردہ اصحاب، علماء، تجار ومقتدر بزرگان ملت شریک تھے، اس جلسے کی صدارت عالی جناب مولانا الحاج ضیاء الدین محمد صاحب بہادر رکن انتظامیہ، ندوۃ العلماء نے فرمائی، بالاتفاق یہ منظور ہوا کہ آیندہ سال ۱۹۱۷ء ایسٹر کی تعطیلات میں دوبارہ ندوۃ العلماء کا اجلاس وہیں منعقد کیا جائے

اوراس کے انتظام کے لیے ایک مجلس بنام مجلس استقبال ندوۃ العلماء مدراس‘ مرتب ہوئی جس میں تقریباً دوسو ارکان وعہدے داران منتخب ہوئے‘‘۔(۱۹)

۱۹۱۷ء کا جلسہ اب تک کے تمام جلسوں میں بے حد کارآمد ثابت ہوا، جس کی خوب پذیرائی کی گئی، بقول مصنف موصوف:

’’اجلاس مدراس، ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں بڑی اہمیت کا مالک تھا، اس کے ذریعہ جہاں ندوۃ العلماء کے مقاصد کو اخلاقی تائید وتقویت حاصل ہوئی وہیں اسے مالی فائدہ بھی پہنچا اور اہل مدراس نے تقریباً پچاس ہزار روپے ندوۃ العلماء کو نذر کیے‘‘۔(۲۰)

مذکورہ جلسۂ مدراس کی کامیابی میں علامہ ضیاء الدین محمدؒ کا بیش بہا حصہ تھا، اس غیر معمولی کامیابی کی گونج ناگپور کے اجلاس منعقد ۲۹/۳۰ / مارچ ۱۹۱۸ء میں بھی سنائی دی، چنانچہ اجلاس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا سید شاہ عبدالحئی حسنی، ناظم ندوۃ العلماء نے مدراس کی کامیابی کا اقرار بایں الفاظ کیا:

’’حضرات! گذشتہ سال اس تعطیل کے موقع پر ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ مدراس میں قرار پایا تھا، اہل مدراس نے جس اولوالعزمی اور اسلامی جوش سے ندوۃ العلماء کا خیر مقدم کیا ہے، اس کی یاد اب تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے، اور ندوۃ العلماء کی تاریخ میں اس کی عملی ہمدردی کا ذکر بڑی خصوصیت سے ہمیشہ کیا جائے گا‘‘۔(۲۱)

علاوہ ازیں اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات کے خلف الرشید خان بہادر علامہ قاری الحاج ضیاء الدین محمد باقوی ویلوری رکن مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرح اعلیٰ حضرت کے ایک اور شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالسبحان باقوی مدراسی رکن انتظامیہ، ندوۃ العلماء (م ۱۹۲۰ء) نے بھی ندوۃ العلماء کا دامے درمے سخنے قدمے ہر اعتبار سے بھرپور ساتھ دیا تھا، وہ سفیر دولت عثمانیہ، ترکی خان بہادر عزت مآب الحاج محمد عبدالعزیز بادشاہ (م ۱۹۱۴ء) غالباً کے داماد تھے۔ سفیر موصوف نے اعلیٰ حضرت سے گذارش کی تھی کہ اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کے عقد سعید کے لیے کسی بااخلاق وبلند کردار عالم دین کا نام تجویز کرے تو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چہیتے شاگرد مولانا قاری عبدالسبحان ابن مولانا محمد قاسم صاحب ولتوری (ضلع ویلور) کا نام پیش کیا جسے

سفیر صاحب نے بخوشی قبول فرمالیا اور ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالسبحان باقوی کو اپنی دامادی میں لے لیا(۲۲)، بعدازاں وہ اپنے وطن مالوف سے مدراس منتقل ہوگئے جہاں ان کو آنریری پریسیڈنسی مجسٹریٹ کا اعلیٰ منصب تفویض کیا گیا تھا، وہ بے حد خداترس، صاحب کردار اور غریب پرور انسان تھے، ان کی تمام زندگی قومی خدمات میں گزری، وہ ندوۃ العلماء کے معزز رکن انتظامیہ ہونے کے علاوہ "معین الندوہ" مدراس کے ناظم بھی تھے۔ جب مدراس میں ندوۃ العلماء کا دوسرا اجلاس ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوا تو انھوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی کامیابی میں نمایاں حصہ ادا کیا، چنانچہ ۸/اپریل ۱۹۱۷ء کو دوسرے اجلاس میں مختلف تجاویز پیش ہوئیں اور اس پر بحث و تمحیص ہوتی رہی اور ردو قبول کے دروازے وا ہوتے اور بند ہوتے رہے، اس وقت مولانا عبدالسبحان باقوی نے ایک اہم ترین تجویز پیش کی جس کو بالاتفاق آرا تسلیم کرلیا گیا، تجویز کے الفاظ اس طرح ہیں:

> "ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ تحریک کرتا ہے کہ مدراس میں ایک مرکزی مجلس "اشاعت الاسلام" کے نام سے باضابطہ قائم کی جائے، وہ اپنا مستقل سرمایہ غربا کی تعلیم، مکاتب اسلامیہ کی اصلاح اور عام مسلمانوں کی بہبودی کے واسطے قائم کرے اور بذریعہ واعظین و مبلغین اس کا انتظام کرے اور اس مجلس اشاعت الاسلام کا دستور العمل زیر نگرانی "معین الندوہ" مدراس مرتب کیا جائے۔لہٰذا یہ تجویز عام رائے کی تائید سے منظور کی گئی"۔(۲۳)

اس تجویز پر باقاعدہ عمل کیا گیا اور ان کی سرپرستی میں اس انجمن اشاعت الاسلام کو فروغ حاصل ہوا جس کے ثمرات و اثرات آج تک محسوس کیے جارہے ہیں اور یہ ادارہ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی شہر مدراس میں فعال و کارگزار ہے۔حضرت مولانا قاری عبدالسبحان باقوی کی خدمات جلیلہ کا اثر ہی تھا کہ ان کے انتقال پر ملال پر ندوۃ العلماء کے انیسویں اجلاس منعقدہ ۱۲/شعبان ۱۳۴۳ھ مطابق ۸/ مارچ ۱۹۲۵ء بہ مقام لکھنؤ ناظم ندوۃ نواب مولانا علی حسن خان صاحب نے اپنے تعزیتی کلمات میں انتہائی دلی جذبات کا اس طرح اظہار کیا۔

> "آج قومی حیثیت سے ہم سب کا فرض ہے کہ ان (مرحومین) کا ماتم کریں، ان کے محاسن کو یاد کریں اور دل سے ان کے واسطے دعائے مغفرت کریں، ان لوگوں کے

کارنامے ایسے ہیں جو ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ہمیشہ یادرہیں گے۔

سب سے پہلے نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یکم فروری ۱۹۲۰ء کو جناب مولانا عبدالسبحان صاحب آنریری پریسیڈنسی مجسٹریٹ، مدراس نے ہم لوگوں کو ہمیشہ کے واسطے داغ جدائی دیا، مولانا ندوۃ العلماء کے دست و بازو اور معین الندوہ مدراس کے سکریٹری بھی تھے، ان کی وفات سے ندوہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا''۔(۲۴)

جامعہ باقیات صالحات، ویلور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے درمیان واقع ذہنی یگانگت، فکری مناسبت اور روابط وتعلقات کی استقامت کا نتیجہ تھا کہ جب اعلیٰ حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری بانی جامعہ باقیات صالحات کا انتقال ۲۲؍ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۵؍ جنوری ۱۹۱۹ء بروز شنبہ ہوا تو اس افسوس ناک خبر کو سن کر ذمہ داران ندوہ بے حد غمزدہ اور رنجیدہ ہوگئے۔ جب تقریباً دو ماہ بعد ۷؍ رجب ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹؍ اپریل ۱۹۱۹ء کو بلگام (کرناٹک) میں ندوہ کا اٹھارہواں جلسہ انعقاد پذیر ہوا تو اس میں تعزیتی قرارداد منظور کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) نے بڑی پرسوز تقریر کی جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

''ندوۃ العلماء کا یہ اجلاس نہایت حسرت وافسوس سے شمس العلماء عبدالوہاب ویلوری، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور مولانا محی الدین حسین چیدہ کی وفات پر اظہار ملال کرتا ہے جن میں اول الذکر مدرسہ باقیات صالحات کے بانی اور جنوبی ہند میں عربی علوم وفنون کے زبردست حامی تھے اور جن کے مساعی جمیلہ سے ہزار ہا اشخاص علوم وفنون اسلامیہ سے بہرہ ور ہوکر احاطۂ مدراس میں مسلمانوں کو فیض بار کررہے ہیں۔ یہ جلسہ درخواست کرتا ہے کہ ان بزرگوں کے واسطے دعائے مغفرت کرے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے نہایت پردرد طریقے سے اس تجویز کی تائید کی، وہ اس وقت ہمہ تن رنج وحسرت کی تصویر تھے اور درحقیقت ایسا ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ ایک انحطاط پذیر قوم سے ارباب کمال کا اٹھ جانا اور وہ ارباب کمال بھی ایسے جو سلف کا نام زندہ کرنے والے ہوں، قوم کے لیے بڑی بھاری مصیبت ہے اور اس مصیبت کا سچا احساس صرف اہل علم ہی کرسکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس تجویز کی تائید کرتے وقت

سید صاحب (سید سلیمان ندویؒ) پر ایک خاص حالت طاری تھی۔

سلسلۂ تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ عام مجالس کا دستور ہے کہ وہاں لوگوں کی وفات پر اظہار رنج وغم کرتے ہیں لیکن ہم جن بزرگوں کا ماتم اس وقت کرتے ہیں وہ درحقیقت ان بزرگوں کا ماتم نہیں کرتے بلکہ تمام قوم کا ماتم ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اب جو دنیا سے اٹھ گئے اور بہت کم امید ہے کہ کوئی ان کا قائم مقام پیدا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ذات سے اسلام کی عظمت قائم تھی اور جن کی نگاہ کی تاثیر سے عالم میں انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔

شمس العلماء مولانا عبدالوہاب صاحب ویلوری احاطۂ مدراس میں اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پور میں دو آفتاب ومہتاب تھے۔ اول الذکر نے چالیس سال تک نہایت زہد وتقویٰ اور اسلامی خلوص سے اسوۂ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نہایت ایثار وسادگی سے زندگی بسر کی۔ ان کے کارنامے ''باقیات صالحات'' کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں جس کے وہ بانی ہیں۔ اس درماندگی کے زمانے میں اس مدرسہ نے مذہب کی نہایت عظیم الشان خدمت انجام دی، جنوبی ہند میں اس درسگاہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو شمالی ہند میں ندوہ اور دیوبند کو۔ سینکڑوں طلبہ یہاں تعلیم وتربیت حاصل کر کے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں''۔ (۲۵)

مولانا سید سلیمانؒ (م ۱۹۵۳ء) اور ان کے محترم استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) کے علمی روابط اہل باقیات سے مستحکم تھے۔ خصوصاً اعلیٰ حضرت بانی باقیات کے تلمیذ خاص وخلیفہ شمس العلماء علامہ الحاج محمد عبدالجبار قادری باقویؒ (م ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء) صدر مدرس مدرسہ باقیات سے مذکورہ بزرگوں کی مراسلت جاری تھی۔ اس ضمن میں شمس العلماء کے عزیز ترین شاگرد مولانا شرف الدین خان باقوی کا بیان کردہ واقعہ قابل توجہ ہے:

''جنوبی وشمالی ہند میں آپ (شمس العلماء علامہ عبدالجبار باقوی) کے علم وفضل کی شہرت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ''الندوہ'' (ماہنامہ الندوہ کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن

خان شروانی کی ادارت میں جاری ہوا) ایک ماہوار رسالہ شائع ہوتا تھا، اس میں کسی نے ''ملاحسن''، پر جو منطق کی مشہور کتاب ہے، تنقید کی تھی، حضرت صدر المدرسین کے اسی رسالے میں مدلل و مسکت جوابات شائع ہوئے تھے، حضرت مولانا شبلی نے آپ کی قابلیت سے متاثر ہوکر آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں صدر مدرس کے منصب پر ماہانہ اسی ۸۰ روپے مشاہرہ قبول کرنے کی دعوت دی لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا (اور کہا کہ میں اپنے شیخ کے مدرسہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا)۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب قبلہ، عالی جناب جمال محی الدین راوتر (م ۱۹۴۹ء) کے ساتھ کار میں مدراس جاتے ہوئے ڈیڑھ بجے باقیات تشریف لائے، درس و تدریس کا وقت نہیں تھا، طلبہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کررہے تھے، میں اور مولوی علیم اللہ صاحب مدراسی جو درجۂ فاضل میں تھے، نئی عمارت کے آخری کمرے میں آرام کررہے تھے (مولانا سلیمان ندوی صاحب) سیدھے کمرے کے پاس پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا، ہم باہر آئے تو مولانا نے دریافت کیا کہ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب قبلہ کہاں رہتے ہیں؟ ہم نے جواب میں کہا کہ آپ سہ پہر ۴ بجے تشریف لاتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگ مولانا (عبدالجبار قبلہ) سے کہہ دیں کہ سلیمان ندوی صرف آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے آیا تھا اور میرا سلام نیاز بھی سنا دینا۔ ہم نے جب آپ کا اسم گرامی سنا تو پریشان ہوگئے، منت سماجت کی کہ ذرا توقف کریں، صدرالمدرس صاحب قبلہ کو اطلاع دیتے ہیں، آپ نے معذرت چاہی اور کہا کہ آج مدراس میں تین بجے پروگرام ہے، زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا اور عازم مدراس ہوگئے۔ جب حضرت قبلہ کو اس کا علم ہوا تو ہم پر سخت برہم ہوگئے کہ اطلاع کیوں نہیں دی''۔(۲۶)

الغرض مندرجہ بالا تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ جامعہ باقیات صالحات اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے باہمی روابط ان کے اپنے بانیوں سے شروع ہوکر تا حال

جاری وساری ہیں، راقم الحروف کو امید قوی ہے کہ مستقبل میں بھی انشاءاللہ یوں ہی باقی رہیں گے۔

حواشی

(۱) سید ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی مطبوعہ ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۴۔ (۲) ایضاً ص ۱۴۹ و ۱۵۰۔ (۳) ڈاکٹر راہی فدائی، باقیات ایک جہاں، دوسرا ایڈیشن، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۳ء، ص ۴۳۔ (۴) ایضاً، ص ۱۹۔ (۵) ڈاکٹر راہی فدائی، جامع باقیات صالحات، حضرت بانی علیہ الرحمہ مسلک و مشرب، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۳۔ (۶) سفیر بلیغ پوری محمد اعظم مولانا ''فغان اعظم''، مطبوعہ شوکت الاسلام، بنگلور ۱۹۱۹ء، ص ۷/۸۔ (۷) سید محمد علی مونگیری قطب عالم، ارشاد رحمانی وفیض یزدانی، دارالاشاعت، خانقاہ رحمانیہ، مونگیر (بہار)، ص ۸۔ (۸) ایضاً، ص ۹۔ (۹) ایضاً، ص ۴۰۔ (۱۰) ڈاکٹر راہی فدائی جامعہ باقیات صالحات، ص ۶۲۔ (۱۱) محمد سلیم صاحب مولانا، ناظم مدرسۂ صولتیہ، مکہ مکرمہ، ''ایک مجاہد معمار'' مطبع ٹیکنکل پرنٹرس، کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۴۷۔ (۱۲) محمد اسحاق جلیس ندوی مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۵۶۔ (۱۳) ایضاً، ص ۶۰۔ (۱۴) باقیات کی زریں تاریخ (بزبان ٹمل) مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور ۱۹۳۰ء، ص ۲۵ ونیز ''آئینہ ماضی'' مجلّہ جشن صد سالہ نمبر مدرسۂ باقیات صالحات، ۱۹۷۴ء۔ (۱۵) شمس تبریز خاں مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء (حصہ دوم) دفتر نظامت، ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۰۔ (۱۶) حضرت علامہ فیضی صدیقی باقوی، تذکرہ علامہ ضیاءالدین محمد، باقیات ایک جہاں (دوسرا ایڈیشن) ۲۰۱۳ء، ص ۹۱۔ (۱۷) محمد اسحاق جلیس ندوی مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، ص ۳۲۰۔ (۱۸) اسدالدین احمد، مدیر ہفت روزہ ''نیر آصفی'' ۷/ جنوری بروز پنج شنبہ، مدراس، ۱۹۰۴ء۔ (۱۹) محمد اسحاق جلیس ندوی مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ اول، ص ۳۱۵۔ (۲۰) ایضاً، ص ۳۱۶۔ (۲۱) شمس تبریز خاں مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء، ص ۱۸۳۔ (۲۲) ایضاً، ص ۱۸۲۔ (۲۳) ایضاً، ص ۲۰۶۔ (۲۴) انوار الحق ڈاکٹر ''انشائے حق''، مطبوعہ ۱۹۸۲ء، حیدرآباد، ص ۱۸۔ (۲۵) شمس تبریز خاں مولانا، تاریخ ندوۃ العلماء، ص ۱۹۱۔ (۲۶) ایضاً، ص ۲۶۷۔ (۲۷) سید قدرت اللہ باقوی ڈاکٹر مولانا، باقیات اور ندوہ، بحوالہ مسودۂ روداد اجلاس، بلگام ۱۹۱۹ء، ص ۶۲، سالنامہ ''نفیر'' ابنائے باقیات صالحات ویلور، ۱۴۰۹ھ، ص ۶۲۔ (۲۸) شرف الدین خان باقوی مولانا، ''میری مادر علمی کے اساتذہ کرام'' باقیات ایک جہاں، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۳ء، ص ۷۵/۷۶۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی چند رباعیوں کا عروضی جائزہ

ڈاکٹر محمد یحییٰ[1] جمیل

مرزا عبدالقادر بیدلؔ دہلوی (۱۰۵۴ھ-۱۱۳۳ء) فارسی ادب کے جلیل القدر شاعر ہیں۔ ان کا کلام، سبک ہندی کی بہترین نمایندگی کرتا ہے۔ کلام بیدل کی گونا گوں خصوصیات، اپنی یافت کے لیے ارباب نقد ونظر کو لگاتار سرگرداں رکھتی ہیں۔ بیدلؔ نے جن اصناف میں داد سخن دی ہے، ان میں رباعیاں بھی شامل ہیں۔ کلیات کے حصۂ رباعیات میں ان کی چار ہزار رباعیاں موجود ہیں۔ ان رباعیوں میں فلسفیانہ، متصوفانہ اور اخلاقی مضامین بیان ہوئے ہیں۔ رباعی کے فن میں بیدلؔ کا غیر معمولی کارنامہ تحقیق در تحقیق کا متقاضی ہے۔ اس مقالہ میں بیدلؔ کی رباعیوں کا عروضی نظام سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رباعی ایک دلچسپ صنف سخن ہے۔ اس کے مختلف نام، چہار بیتی، دوبیتی، ترانہ، مصراعی، جفتی وغیرہ رائج رہے ہیں۔ رباعی بحر ہزج سے مخصوص ہے۔ ماہرین عروض نے بحر ہزج سے دس افاعیل اخذ کیے ہیں، ان میں ایک سالم اور باقی زحافات ہیں۔ رباعی کے کل چوبیس اوزان بنائے گئے ہیں، جن میں ۱۲ دائرۂ اخرب کے جو مفعول سے اور ۱۲ دائرۂ اخرم کے جو مفعولن سے شروع ہوتے ہیں۔

رباعی گو کے لیے آزادی ہے کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق چار مصرعوں میں چار تک مختلف وزن استعمال کرے۔ بیدلؔ نے صرف ایک وزن میں بھی رباعی کہی ہے اور دو سے چار تک مختلف اوزان میں بھی۔ یہ بیدلؔ کا فنکارانہ کمال ہے کہ ان کی مختلف الاوزان رباعیاں بھی رواں محسوس ہوتی

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، شریمتی کیشر بائی لاہوٹی مہاودیالیہ، امراوتی (مہاراشٹرا)۔

ہیں۔ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے اہم نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم رقم طراز ہیں کہ:

"...... یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شاعر کا اسلوب اور اس کا آہنگ شعر بالکل ہی بحروں اور اوزان کے تابع ہوتا ہے۔ اچھا شاعر بحر کی رو میں بہہ نہیں جاتا بلکہ اس کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے آہنگ سے استفادہ کرتا ہے"۔(۱)

بیدلؔ بھی بحر کو گرفت میں لے کر اس کے آہنگ سے استفادہ کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں وہ اپنی قلندرانہ فطرت کے زیر اثر مروجہ اوزان سے انحراف برتتے ہوئے نیا آہنگ بھی مرتب کر دیتے ہیں۔

راقم نے رباعیات بیدلؔ کے عروضی تجزیے کے لیے ان کے کلیات سے ابتدائی ۵۰ رباعیوں کا انتخاب کیا ہے اور مختلف الوزن مصرعوں کے پیش نظر رباعیوں کی مرقوم الذیل طریقے سے خانہ بندی کی ہے۔

تفصیل رباعی	تعداد رباعی	فی صد
الف۔ چاروں مصرعے ہم وزن	۱	۲٪
ب۔ چاروں مصرعے مختلف الوزن	۵	۱۰٪
ج۔ تیسرا مصرعہ مختلف الوزن	۱۴	۲۸٪
د۔ کوئی دو مصرعے مختلف الوزن	۲۵	۵۰٪
ہ۔ کوئی تین مصرعے مختلف الوزن	۵	۵٪

رباعی کے تیسرے مصرعہ کا مختلف الوزن ہونا، جسے حصہ "ج" میں اور تین مصرعوں کا مختلف الوزن ہونا، جسے حصہ "ہ" میں رکھا گیا ہے۔ ایک ہی بات ہے مگر شعرا عموماً خصی رباعی میں تیسرا مصرعہ مختلف الوزن استعمال کرتے ہیں، اس لیے اس کی تخصیص کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا تقسیم کے مطابق بطور مثال ایک ایک رباعی کی تقطیع کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

(الف) چاروں مصرعے ہم وزن

دنیاست بساطی کہ چو آئی آنجا جز چشم برفتن نکشائی آنجا
شرم است غم خانہ خدائی خوردن آں کہ بہ مقامی کہ نہ پائی آنجا(۲)

تقطیع:

مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
دن یاس	ب ساطی ک	چ آئی آ	جا
جز چش م	ب رف تن ن	ک شائی آ	جا
شر مس ت	غ ے خان	خ دائی خر	دن
آ کہ ب	م قا می ک	ن پائی آ	جا

(ب) چاروں مصرعے مختلف الوزن

بیدل از طینت الم پرور ما   گل خجلت زخم می کشد در بر ما
از بس ہمہ تن غبار کلفت داریم   گر رنگ برد سایہ شود برسر ما (۳)

تقطیع:

مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعل
بی دل از	طی ن تے	الم پرو	ر ما
مفعول	مفاعلن	مفاعیل	فعل
گل خج ل	ت زخم می	ک شد در ب	ر ما
مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فاع
از بس ہ	م تن غ با	ر کل فت دا	ریم
مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعل
گر رن گ	ب رد سا ی	ش ود بر س	ر ما

(ج) تیسرا مصرعہ مختلف الوزن

حمد دو جہان سزای ذاتی یکتا   کز پردۂ غیر او نجو شد من و ما
نتواں لب آہنگ ثنایش وا کرد   تا او نکند بقدرت خویش ادا (۴)

تقطیع:

مفعول	مفاعلن	مفاعیل	فعل
حم دے د	ج ہاں س زا	ی ذاتی ی	ک تا
کر پر د	ا غے را و	ن جوشد م	ن ما
تا او ن	ک ند یق د	ر تے خیش	ادا

تیسرے مصرعے کی تقطیع یوں ہوگی

مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فاع
نت واں ل	ب آ ہن گ	ش نا لش وا	ک رد

(د) کوئی دو مصرعے مختلف الوزن:

حمد دو جہان سزاست سلطانی را کو پست نخواست عجز بینائی را

تا موری را زخاک رہ بر دارد افگند بیادست سلیمانی را (۵)

تقطیع:

مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فع
حمدے دُ	ج ہا س زا	س سل طانی	را
کو پس ت	ن خا س عج	ز بی نائی	را
مفعولن	فاعلن	مفاعی لن	فع
تا موریُ	را زخا	ک رہ بردا	رد
مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
اف گن د	بر یا دس ت	سُ لے مانی	را

(ہ) کوئی تین مصرعے مختلف الوزن

بیدل نی نقص و نی کمال است اینجا نی دام و نہ پروانہ و نہ بال است اینجا

نی ساز فراق و نی وصال است اینجا دل آبلہ پای خیال است اینجا (۶)

تقطیع:

مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فع
بی دل نی	نق ص نی	ک مالس تی	جا
مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
نی دامو	ن پر وان	نہ بالس تی	جا
نی ساز	ف راق نی	وصالس تی	جا
دل آ ب	ل اے پا ی	خ یالس تی	جا

بیدل کی چند رباعیاں عروضی نقطۂ نگاہ سے محل نظر ہیں۔ مثلاً درج ذیل رباعی میں پہلا شعر (ابتدائی دو مصرعے) ایک وزن میں اور (دوسرا شعر) آخری دو مصرعے مختلف وزن میں تقطیع ہوتے

ہیں۔لیکن تیسرے اور چوتھے مصرعوں کا وزن رباعی کے ۲۴/اوزان سے نہیں ہے۔رباعی ہے:

آں آئینۂ قدرت ذات یکتا آں جوہر ایجاد صفات و اسما (۷)
در غیب احد است و در شہادت احمد اینست رموز خواجۂ ہر دوسرا

تقطیع:

مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
آ آ ی	ن ئے قدر	ت زاتی یک	تا
آں جوہ	ر ای جاد	ص فا تو اس	ما
مفعول	مفاعیل (مفاعیلن)	مفاعیلن	فع
در غے ب	ح دس تو در	ش ہا دت اح	مد
ای نس ت	رموز ے خا	ج ئے ہر دس	را

اس رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرعوں کی تقطیع، حشو اول میں مفاعیلن کے بغیر ممکن نہیں۔جبکہ یہاں مفاعیل کا محل ہے۔نیز رباعی کے افاعیل میں کم از کم ایک سالم اور باقی مزاحف مستعمل ہیں۔یہ بیدل کا انحراف ہے کہ انہوں نے دو مرتبہ سالم افاعیل استعمال کیے ہیں۔

کلیات بیدل کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو،جس کے چاروں مصرعوں میں چار مختلف اوزان استعمال ہوئے ہیں۔اس کے چوتھے مصرعے کا وزن محل نظر ہے۔

ظالم پوشد لباس خون یافتہ را تا زیر کند خصم زبوں یافتہ را (۸)
باسنگ دلان شعلہ خو سختی کن بردار بہ آہن آہنی تافتہ را

تقطیع:

مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعل
ظالم پو	شد ل با	س خو یا ف	ت را
مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعل
تا زی ر	ک ند خص م	ز بو یا ف	ت را
مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
با سن گ	دلا شع ل	ءخو سخ تی	کن
مفعول	مفاعیلن	مفعولن (مفاعیل)	فعل
بردار	ب آ ہ ن آ	ہ نی تا ف	ت را

حشو دوم میں ''ہنی تاف'' کی تقطیع بروزن ''مفاعیل'' سہولت سے ہوجاتی ہے لیکن اصل وزن ہے، مفعول مفاعیلن مفعولن فعل۔ اگر مفعولن کے مطابق تقطیع کرنی ہوتو ''آ ہنی'' کے نون کو مشدد کرنا پڑے گا، یعنی ''آ ہن نی''۔ متقدمین مثلاً رودکی، فردوسی، عنصری، فرخی، ناصر، خسرو وغیرہ نے اکثر مقامات پر وزن کی رعایت سے مخفف حروف کو مشدد اور مشدد حروف کو مخفف کیا ہے(۹)۔ ممکن ہے بیدلؔ نے بھی یہاں آہن کے نون کو مشدد کیا ہو۔ لیکن ایسی تقطیع سے ضرب (آخری رکن) میں ''تُرا'' بروزن فَعِلُن بچتا ہے۔ لہٰذا حشو دوم میں الف حذف کر کے ''ہن نی تف'' پڑھنے پر ''ترا'' بروزن فعل حاصل ہوگا۔ یہ زبردستی کا سودا مناسب نہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ حشو دوم میں مفعولن کی جگہ مفاعیل رکھ کر اسے بیدلؔ کا انحراف تسلیم کریں کہ انہوں نے نیا ایک آہنگ ترتیب دے دیا۔ اس طرح ان کے دو نئے اوزان ملتے ہیں:

۱۔مفعول مفاعیلن مفاعیلن فعل

۲۔مفعول مفاعیلن مفاعیل فعل

مندرجہ بالا مثالوں سے اس عظیم شاعر کے کلام میں عروضی سقم کی نشاندہی مقصود نہیں ہے۔ بیدلؔ فارسی کے ان عظیم المرتبت شعرا میں سے ہیں جن کے کلام سے فنی اور عروضی اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ بیدلؔ نے شعوری یا لاشعوری طور پر چند نئے آہنگ وضع کر کے ہمیں ان سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

مآخذ

(۱) مغنی تبسم، ماہنامہ شاعر، ممبئی ''غالب نمبر'' ۱۹۶۹ء، ص۱۱۴۔ (۲) رباعی نمبر ۱۲، حصۂ رباعیات، کلیات بیدلؔ، مطبع صفدری، ۱۲۹۹ھ، ممبئی، ص۲۔ (۳) رباعی نمبر ۸، ایضاً۔ (۴) رباعی نمبر ۱، ایضاً۔ (۵) رباعی نمبر ۲، ایضاً۔ (۶) رباعی نمبر ۱۱، ایضاً۔ (۷) رباعی نمبر ۴، ایضاً۔ (۸) رباعی نمبر ۲۸، ایضاً، ص۳۔ (۹) ڈاکٹر انجم ضیاء الدین تاجی، ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل، فارسی شاعری کے اسالیب کا مطالعہ، پونے، جون ۲۰۱۱ء، ص۲۶۔۲۷۔ (۱۰) رباعی نمبر ۶، حصۂ رباعیات، کلیات بیدلؔ، ص۲۔

علامہ شبلی کا مقالہ اردو ہندی۔ ایک تجزیہ

ڈاکٹر محمد شارق

علامہ شبلی نعمانی ایک قاموسی شخصیت کے مالک تھے وہ اپنے عہد کے سرخیل اور قافلہ سالار تھے ان کی شناخت کسی ایک پہلو پر منحصر نہیں ہے بلکہ کمالات کے مجموعہ کی تشخیص کا نام شبلی ہے۔ اسی لیے پروفیسر ابوظفر عبدالواحد لکھتے ہیں:

> ''شبلی کی شخصیت بڑی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت تھی۔ یہ بتانا آسان ہے کہ وہ کیا کچھ تھے لیکن بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا نہ تھے۔ ہاں وہ سب کچھ تھے، روشن خیال مولوی، رنگین مزاج ادیب، شعلہ نوا مقرر، مصلحت شناس شاعر، مورخ، مصلح قوم، نقاد، ایک جری سپاہی، زودرنج، ذکی الحس، عالم، وارفتۂ عمل۔ لیکن عالم باعمل''۔(۱)

علامہ شبلی کے افکار و نظریات گزشتہ ایک صدی سے ہمارے اذہان وقلوب پر اثر انداز ہیں اور آج قوم وملت بلکہ عالم اسلام جن حالات اور مسائل سے دوچار ہے ان میں علامہ شبلی کے افکار و نظریات کی معنویت دوچند ہوگئی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دنیا کے بیشتر ممالک میں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی لیکن وہ اس زمانے میں خواب غفلت کی نیند سو رہے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر انگلستان، فرانس، جرمنی وغیرہ نے اپنی علمی صلاحیت اور تاجرانہ وسپاہیانہ جدو جہد کے ذریعہ مشرقی ممالک میں داخل ہوکر اپنی علمی وفکری برتری اور سیاسی وفوجی بالادستی کا دعویٰ کرنے لگے اور بڑی تلبیس ودسیسہ کاری سے مسلم ممالک کی تاریخ کو تاریک بنا کر اور مسلمان حکمرانوں کی شبیہ بگاڑ کر پیش کرنے لگے۔ ان مغربی فضلاء میں پہل کرنے والے ڈاکٹر اسپرنگر تھے، اس کے بعد ڈاکٹر جے مولر، ڈاکٹر ویل وان کریمر، برتھال سینٹ ہیمر اور گولڈزیہر وغیرہ کی سربراہی

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

میں یورو پی اقوام کے دماغوں کی کھیپ اس مہم میں مصروف ہوگئی۔ بظاہر ان کا تعلق کسی مشنری سے نہیں تھا لیکن مناظرہ پیشہ عیسائی ضرور تھے۔ جنھوں نے اپنے فاسد مقاصد کی برآری کے لیے اسے تحقیق اور ریسرچ کا نام دیا تاکہ مسلم علماء اور مفکرین بھی ان کے خیالات وافکار کو تحقیق کی شکل میں سنجیدگی سے اسے قبول کرسکیں۔ اس کے لیے وہ مسلمانوں کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرکے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے بعض تحریروں کو غلط سیاق وسباق سے پیش کرتے تاکہ ان کی فاسد خواہشات کی تکمیل ہوسکے۔ ان مستشرقین کا جواب سب سے پہلے شبلی نے دیا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس تحریر سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ:

''ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنھوں نے انہیں کے طریقے سے انہیں کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کی فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کی علم وتمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی''۔(۲)

علامہ شبلی کی معروضی فطرت اور طبیعت کا میلان ایسا تھا کہ حقائق و معارف کا عرفان اور منطقی خیالات خود بخود درونما ہونے لگتے تھے۔ وہ مطالعے کی وسعت کے سبب زمانے کے مسائل اور حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ گفتگو و تحریر کا انداز واضح اور فیصلہ کن ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی قوم وملت پر معترضین نے کوئی وار کیا تو شبلی نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دندان شکن جواب دیا۔ میدان جنگ مذہبی ہو یا قومی اور ادبی ہو شبلی ہر جگہ مرد میدان نظر آتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی وہ لازوال تحریریں ہیں جو اب مقالات شبلی کی شکل میں آٹھ جلدوں میں موجود ومحفوظ ہیں۔ ان مقالات کی علمی و تحقیقی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ان کا اعتراف مسلسل کیا جاتا رہا ہے اور یہ احساس تمام نقادوں میں مشترک ہے کہ علامہ شبلی کی مستقل تصنیفات اور ملی وملکی خدمات کی طرح یہ مقالات بھی اس لیے اہم ہیں کہ ان کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما تھا کہ جو لوگ ان کی تصانیف کا کسی وجہ سے مطالعہ نہیں کرسکتے وہ کم از کم ان مقالات ہی سے استفادہ کرسکیں کیونکہ مقصد صرف اسلام کی محبت اور اصلاح امت ہے۔ اخبارات و رسائل میں ان مقالات کو

شائع کرنے کا مقصد ہی یہی تھا لیکن یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ افادہ عام میں عامیانہ انداز بہرحال نہیں آپایا، یعنی زبان و بیان میں مولویانہ اور واعظانہ انداز کی جگہ وہی محققانہ طرز ہے جو شبلی کی پہچان ہے اور وہ پہچان بھی یکساں ہے جسے زبان و بیان کی چاشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علمی رنگ بھی ہے جس کی ایک نشان دہی اس طرح کی گئی کہ:

''وہ کسی بات کو یونہی اور واجبی طور پر نہیں بیان کرتے بلکہ جو بات کہتے ہیں اس کے لیے اپنے پاس دلائل و براہین رکھتے ہیں اور پڑھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک منطقی کی طرح ایک دعویٰ پیش کر کے اس کی دلیل لاتے ہیں اور صغریٰ و کبریٰ قائم کر کے اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہر ذی عقل اور غیر متعصب بھی اسے ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ مولانا کے قلم میں ایک توازن برابر قائم رہتا ہے۔ اپنوں کے بارے میں لکھ رہے ہوں یا غیروں کے، کسی اعتراض کا جواب دے رہے ہوں یا کسی پر خود اعتراض کر رہے ہوں وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے''۔(۳)

زندگی کے داخلی مسائل اور اس کے حقائق سے روشناسی نہایت ہی مشکل امر ہے اور اس سے کہیں مشکل معاشرتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کا سامنا کرکے اعتدال کے ساتھ موزوں انداز میں ان عمیق نکتوں کو تلاش کرنا ہے جن سے گفتگو مدلل ہوسکے۔ شبلی علم کلام کے باب میں دلائل و براہین کے اسالیب سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی ضروری چیز یہ ہے کہ دلائل اور براہین ایسے صاف اور سادہ پیرایے میں بیان کیے جائیں کہ سریع الفہم ہونے کے ساتھ دل میں اتر جائیں، قدیم طریقے میں پیچ در پیچ مقدمات، اصطلاحات اور دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے مخالف مرعوب ہوجاتا تھا لیکن اس کے دل میں یقین اور وجدان کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی''۔(۴)

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شبلی نے صنف مقالہ کو سامنے رکھ کر شعوری کوشش کی ہے۔ جس سے ان کی تحریر منظّم اور مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ ان مقالات کے ذریعہ شبلی کے تبحر علمی، وسعت نظری، نکتہ رسی، مطمح نظر کی وضاحت اور خیال آفرینی کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ جب بھی

کسی امر کو زیر بحث لاتے ہیں تو اس کے دلائل و براہین آسان اور سادہ پیرایے میں بیان کرتے ہیں۔ تصنع اور تکلف سے احتراز کرتے ہیں۔ موضوع کے داخلی مسائل کے شواہد، تجربہ اور تاثرات کا غیر جانب داری سے مطالعہ کر کے منطق کی روشنی معروضی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ کلامی انداز ہے جس نے شبلی کے خیالات کو قبولیت اور اس سے زیادہ ان کی اہمیت کا اعتراف کرایا ہے، یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

''مولانا شبلی اپنے مراجع و مآخذ کے لحاظ سے مورخ اور اسلوب و طرز ادا کے لحاظ سے انشا پرداز یقیناً قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن اگر اغراض و مقاصد پر نظر کی جائے تو اس پہلو سے وہ ایک زبردست متکلم تھے۔ اس لیے یہ دعویٰ غلط نہیں کہ مولانا کی متکلمانہ حیثیت کو ان کی دوسری حیثیت پر ترجیح حاصل ہے''۔(۵)

شبلی کی متکلمانہ صفت کا ایک نہایت وقیع اور سنجیدہ اعتراف درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

''اسکندریہ کے کتب خانے کو جلانے کا الزام مستشرقین نے مسلمانوں پر لگایا تھا۔ شبلی نے اس پورے لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا، گبن، وائٹ، ڈیسائسی (Descacy)، کریل وغیرہ کی تحریریں Spectator کے پرچے Encyclopaedia کی جلدیں مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث میں حصہ لیا اور پرزور دلائل سے ان الزامات کی تردید کرنے کے بعد لکھا کہ وہ دن آئے گا جب یورپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ۔

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکلا'' (۶)

شبلی نے مختلف موضوعات پر متعدد مقالات تحریر کیے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، جن کو ان کے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے موضوعات کے اعتبار سے آٹھ جلدوں میں دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ شبلی کے تمام مقالات، موضوعات اور اسالیب کے لحاظ سے نہایت پرمغز اور مفید ہیں۔ شبلی کے محققین و ناقدین و باحثین کو اس ضرورت کا احساس رہا کہ ان مقالات کا الگ الگ تحلیل و تجزیہ کیا جائے اور ان افکار و خیالات کو نمایاں کیا جائے جو ان مقالات میں پنہاں ہیں۔ ایسی کچھ کوششیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں اور اسی ضرورت کے پیش نظر میں نے شبلی

کے مقالہ ''اردو ہندی'' کا انتخاب کیا۔ تاکہ اس کے مطالعہ و تجزیہ سے اردو ہندی زبان کی بقا اور تحفظ کے باب میں شبلی کے نظریات اور دلائل نمایاں ہو سکیں۔

شبلی کا یہ مقالہ ۱۹۱۲ء میں ایک نوٹ کی شکل میں اس وقت لکھا گیا جب الٰہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنا کیولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت والفاظ کے ساتھ پڑھا جا سکے۔ نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے۔ اس کمیٹی کے چیف سکریٹری مسٹر برن تھے۔ انہوں نے اسکیم کی دفعہ ۳، ۴ کے مطابق ایک تجویز پیش کی جس کے تحت ورنا کیولر سے ایک وسیع اور دیرپا اثر ٹالا جا سکتا تھا۔ چونکہ علامہ شبلی نعمانی اس کمیٹی کے ممبر تھے، اس لیے پہلے انہوں نے مذکورہ دفعات کا بغور مطالعہ کیا اور نہایت غور و توجہ سے ان پر نظر کی اور پھر اپنی رائے کا اتنے موثر انداز میں اظہار کیا کہ مسئلہ کا فیصلہ خود ہندو ممبروں کی تائید سے مولانا ہی کی رائے پر ہوا اور بقول مرتب مقالات شبلی ''اس طرح اردو، ہندی بن جانے سے بال بال بچ گئی''۔ اس مقالہ میں شبلی نے پہلے ان دفعات کا ماحصل پیش کیا جو درج ذیل ہے:

> ''اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں کیونکہ ان کی گرامر متحد ہے اور جن دو زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں۔
> اس بنا پر ورنا کیولر کورس ایسی مشترک زبان میں بننا چاہیے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں بن جائے''۔(۷)

اس تجویز کی روشنی میں شبلی نے بحث کی ہے کہ دفعہ ۳، ۴ کی مناسبت سے اردو ہندی زبان کی گرامر متحد ہے اور اگر دونوں زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے تو وہ زبانیں ایک ہوتی ہیں جب کہ ہندی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی نثر اور نظم دونوں کی گرامر مختلف ہے اس لیے ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور مہارت کے لیے رامائن تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہیے۔ آگے انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ مسٹر برن کی مراد ہندی لفظ سے کیا ہے؟ اس سوال کا جواب شبلی خود لکھتے ہیں کہ ہندی دو قسم کی ہے۔ ایک دیہات کی جو گنوار بولتے ہیں، دوسری شہر کی جو تعلیم یافتہ ہندو روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ دیہات کی ہندی کو شبلی نے سرے سے یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ جب

انگلستان، ایران اورعرب میں دیہاتی زبان کو نصاب تعلیم میں داخل نہیں کرسکتے تو ہندوستان میں کیسے ممکن ہے اور یہ بھی کہ یہ ہندی ہر ضلع کی الگ ہے اور ان میں باہم اتنا اختلاف ہے کہ ایک جگہ کی ہندی دوسری جگہ مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے، اس لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ کس ضلع کے دیہات کی زبان کورس میں داخل کی جائے، اس لیے یہ زبان تو زیر بحث ہونے ہی کے لائق نہیں، ہاں بحث دوسری قسم یعنی شہر کی زبان کے تعلق سے ہوسکتی ہے، یہ بحث خاصی تفصیل سے ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہروں میں ہندی اور اردو زبان افعال، مفرد الفاظ کی اکثریت اور گرامر کے لحاظ سے ایک ہی ہیں مگر شہروں میں جو کم تعلیم یافتہ ہندو یا جو پنڈت ہیں وہ فارسی اور عربی الفاظ کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کا زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن عام تعلیم یافتہ ہندو جو ہندوستانی زبان میں مضامین اور آرٹیکل لکھتے ہیں۔ نیز متعدد معیاری اردو رسالوں جیسے زمانہ، ادیب اور زبان کے مدیر بھی ہیں ان کی اردو اور مسلمانوں کی اردو میں مطلق فرق نہیں ہے، بلکہ ان کی زبان اور اعلیٰ درجہ کے مسلمان انشاپردازوں کی زبان میں بھی کچھ فرق نہیں ہوتا، وہ عموماً عربی اور فارسی کے علمی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ علمی خیالات کے لیے معمولی ہندی کے الفاظ کافی نہیں ہوسکتے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سنسکرت زبان کے الفاظ اگر استعمال کیے جائیں گے تو سمجھنے والوں کی تعداد تھوڑی رہ جائے گی۔ غالباً یہاں علامہ شبلی کی مراد الفاظ کی ثقالت سے ہے۔ الفاظ کی ثقالت کے حوالے سے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اپنے مقالہ ''اردو ہندی مسئلہ۔ا'' میں بہت عمدہ بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ایک بہت بڑے سرکاری کرمچاری جن کی ماہانہ تنخواہ لگ بھگ دو ہزار روپے تھی اپنے ماتحتوں کو انگریزی میں اس طرح طعنہ دیتے تھے You are very laziness۔ اتنا پڑھا لکھا آدمی ایسی ہولناک غلطی کیوں کرتا تھا؟ وجہ یہ ہے کہ اردو میں سست اور کاہل ہونے کی صفت کو سستی اور کاہلی کہتے ہیں۔ سست اور کاہل یا نکما اور کام چور سات آٹھ برس کے بچے سمجھ لیں گے۔ اسی طرح سستی، کاہلی، نکماپن اور کام چوری بھی اچھی طرح سمجھ لیں گے اور بول لیں گے (کرمنڑی) اور (کرمنڑیتیا) (اکرمنڑی) اور (اکرمنڑی تیا) ان کے گلے سے نہیں اترے گا اور نہ ان کے دماغ میں دھنسے گا۔ لڑکپن میں جو ہندی کتابیں ان افسر

نے پڑھی تھیں ان میں اوپر بتائے گئے سادہ اور سہل اور فطری اسماء اور صفات کی جگہ انہیں زبردستی رٹوایا گیا ہوگا اور دونوں کا فرق ان کے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اسی سے بے چارے You are laziness (تم بہت سستی ہو) کہتے تھے۔ کسی قوم کو احمق بنانا ہو تو اس قوم کے بچوں کو آسان اور سہج لفظوں کے بدلے جبڑا توڑ لفظ چاہے وہ دیوبانی سنسکرت ہی کے شبد ہوں گھونٹوا دیجیے سب بچے احمق ہو جائیں گے''۔(۸)

سنسکرت کے مشکل الفاظ کو عام بول چال میں استعمال کرنا یا طلبہ پر جبراً تھوپنا یہ عقل مندی نہیں حماقت ہے۔ اس طرح کی بات فراق گورکھپوری نے یوں ہی نہیں کی بلکہ آنے والی نسل کو مشکلات سے نجات دلانے کی نظری اور علمی تدبیر ہے۔ فراق سے بہت پہلے علامہ شبلی نے عقل و منطق کی بنیاد پر اس مسئلہ یا مشکل پر توجہ مبذول کی تھی اور وقت پر ورنا کیولر اسکیم کی خام خیالی کو واضح کیا تھا کہ اگر مقصد یہ ہے کہ کالج کے اخیر کلاسوں تک ورنا کیولر کا سلسلہ قائم رہے تو ایسے نصاب کی ضرورت ہوگی جو ہر طرح کے علمی مضامین اور خیالات کو ادا کر سکے۔ اس کے لیے عام روزمرہ کے الفاظ کافی نہیں ہوں گے بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑیں گے یہ علمی زبان یا تو سنسکرت ہوگی یا عربی۔ دونوں زبانوں سے ایک ساتھ استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ دونوں میں دکن اور شمال کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی ایک زبان سے الفاظ مستعار لیے جائیں گے تو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش پیدا ہو جائے گی۔ انہیں کشمکش کے پیش نظر شبلی نے دونوں زبانوں کے اختلاط سے درج ذیل نقصانات تحریر کیے ہیں۔

''(۱) ہمیشہ ایک کشمکش رہے گی۔ نصاب بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی قومی زبان یعنی عربی اور سنسکرت کی طرفداری کریں گے اور کبھی کوئی فریق کامیاب ہوگا اور کبھی کوئی فریق۔ (۲) دونوں سے مل کر ایک نئی زبان پیدا ہوگی جو نہ اردو ہوگی نہ ہندی۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو اس حد تک ترقی دینا چاہیے کہ وہ علمی زبانیں بن جائیں اور ان میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین ادا کیے جا سکیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں کو علاحدہ علاحدہ آزادی کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے اور ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہو۔ ہم کو اس بات پر بھی سب سے زیادہ نظر رکھنی چاہیے

کہ زبان کو اس حد تک ترقی دینی چاہیے کہ اس کی تصنیفات ہمارے صوبے تک محدود نہ رہیں بلکہ ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں رواج پاسکیں، یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ پنجاب، بنگال، مدارس، بمبئی میں قابل اور لائق مسلمان جو تصنیفات انگریزی زبان کے علاوہ کرتے ہیں وہ اردو میں ہوتی ہیں اور یہ وہی اردو ہے جو سنسکرت الفاظ سے بالکل خالی ہے، اس لیے اگر اس زبان کو سنسکرت الفاظ میں لاکر ہندی اور اردو کی ایک زبان بنائی جائے گی تو ایک زبان جو تمام ہندوستان کی اور کم از کم یہ کہ تمام مسلمانوں کی لینگوا فرنکا ہے گھٹ کر ایک صوبہ بلکہ ایک ضلع کی زبان رہ جائے گی''۔(۹)

علامہ شبلی نے اردو ہندی زبانوں کے امتزاج کو جس خوش اسلوبی اور دلیل کے ذریعہ تحفظ دیا اور دونوں کی تہذیب و روایت کو باقی رکھا وہ مولانا شبلی ہی کا حق ہے اور یہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور خداداد صلاحیت ہی ہے کہ انہوں نے مسٹر برن کی اس نیت کو بھانپ لیا جو ان کی تمام تجویزوں کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ یہی مغالطہ انگیز فکر تھی کہ ہندی اور اردو کی گرامر ایک ہیں، اس کے لیے اولاً تو انہوں نے ایک ہی گرامر والی دو زبانوں کے بارے میں کہا کہ اس سے صرف یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں یا ایک دوسرے سے نکلی ہیں اور جس کی سب سے عمدہ مثال اسیرین زبانوں کا خاندان ہے جن میں گرامر کے لحاظ سے تو عام اتحاد ہے لیکن پھر بھی زبانیں ایسی مختلف ہیں کہ ان سے مشترک کورس تیار نہیں کیا جاسکتا، اس کا سب سے بڑا ثبوت عربی و عبری زبانوں کا معاملہ ہے جن کی گرامر، اردو ہندی کے اتحاد سے کہیں زیادہ ہے لیکن ان کا کوئی مشترک کورس نہیں بن سکا اور نہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح مسٹر برن کی تجویز میں یہ دور کی کوڑی بحیثیت دعویٰ کی تھی کہ ہندی نظم کی گرامر اور ہے اور نثر کی اور شبلی نے اس خیال کو سخت منطقی مغالطہ سے تعبیر کرتے ہوئے حیرت انگیز کہا اور لکھا کہ:

''مسٹر برن کا یہ دعویٰ اور سخت حیرت انگیز ہے کہ ہندی نظم کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی گرامر نثر کی گرامر سے مختلف ہے، نظم و نثر میں گرامر کا ایک خفیف فرق تمام زبانوں میں اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ نظم میں وزن کی ضرورت سے الفاظ آگے پیچھے

کردیے جاتے ہیں لیکن اس کے لیے علاحدہ گرامر بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی متعلم
خود سمجھ لیتا ہے کہ وزن کی ضرورت نے یہ تغیر کردیا ہے۔ ہندی زبان کی نظم کی گرامر نثر
سے مختلف ہوگی تو اسی قدر ہوگی جس قدر نظم کی گرامر مختلف ہے''۔(۱۰)

مسٹر برن کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ تلسی کی رامائن کورس میں اس لیے داخل کی جائے کہ ہندی نظم کی گرامر سے واقفیت اور مہارت حاصل ہو، ہندی ادب کی بات ہوتی تو ظاہر ہے مولانا شبلی کو اس پر کیا اعتراض ہوتا، لیکن متحدہ گرامر کے وجود اور پھر اس کے متحدہ طور پر شامل نصاب ہونے اور ہندوؤں کے لیے لازمی اور مسلمانوں کے لیے مناسب ہونے کے پیچھے جو نیت کام کررہی تھی، مولانا شبلی کی نظر سے وہ مخفی کیسے رہتی؟ اس لیے انہوں نے جو اسباب و دلائل پیش کیے وہ آج بھی اس نزاع کے ماہرین کے لیے رہنما اصول ہیں، انہوں نے کہا کہ ہاں رامائن کی گرامر مختلف ہے لیکن اس کی وجہ اس کی قدامت ہے یعنی وہ تین سو برس پہلے کی زبان ہے، اس زمانہ کی نثر بھی آج کی نثر سے اسی قدر مختلف ہوگی، پھر رامائن کی زبان آج کل کی ہندی نہیں، اس لیے اگر اس کو کورس میں اس لیے داخل کیا جاتا ہے کہ اس سے زبان کی ابتدائی حالت اور عہد بہ عہد کی تبدیلیوں سے واقفیت ہو تو یہ رائے بالکل بجا ہے لیکن اس غرض کے لیے دو باتیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ ایسا کورس اسکول کے لیے موزوں نہیں بلکہ یہ کالج کے کلاسوں کا مضمون ہے، دوسرے یہ خالص ہندی زبان کے لیے ہونا چاہیے یعنی ان کے لیے جو ہندی بھاشا اور سنسکرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، عام ورنا کیولر کورس کے لیے یہ قطعی موزوں نہیں۔

مولانا شبلی کے یہ دلائل اور بحث تھی ہی اس قابل کہ مسٹر برن کو اپنی تجویز واپس لینی پڑی، کیونکہ مسئلہ کا اصل حل بھی شبلی نے یہ کہہ کر پیش کردیا تھا کہ:

''میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ
زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے تقریباً آزاد ہو اختیار کی جاسکتی ہے لیکن ہائر کلاسوں
کے لیے اردو اور ہندی زبانوں کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہیے اور اسی صورت میں
دونوں اعلیٰ درجہ تک ترقی کرسکتی ہیں''۔(۱۱)

ہم اوپر لکھ چکے ہیں اس نوٹ کو شبلی نے جب کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو کمیٹی کے ہندی داں

ممبروں نے بھی شبلی کی حمایت کی ۔آج ہماری تہذیب و روایت کی دونوں زبانیں اپنی ارتقائی منازل طے کررہی ہیں ۔اس معنی میں ہم ہندوستانی بہت خوش نصیب ہیں کہ ہماری دونوں قومی زبانیں ایسی ہیں جو بین الاقوامی سطح پرروزافزوں ترقی پذیر ہیں جبکہ آج بھی یہ دونوں زبانیں اپنے افعال،الفاظ اور گرامر کے لحاظ سے جداگانہ ہیں۔

حوالے

(۱) پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، صبا حیدرآباد،شبلی نمبر،ص ۵۷ ،مرتبہ سلمان اریب حسین شاہد، ۱۹۵۸ء۔(۲) حیات شبلی ،مولانا سید سلیمان ندوی،ص ۱۶، مطبوعہ ۲۰۰۸ء۔ (۳) البصیر (شبلی نمبر) مضمون مقالات شبلی ، عبیداللہ خاں، مدیرغلام دست گیر، دسمبر ۱۹۵۷ء، اسلامیہ کالج ، چینوٹ ۔(۴) شبلی علم الکلام،ص ۱۹۷۔(۵) سہ ماہی فکر ونظر،علی گڑھ، مدیر شہر یار،شبلی اور علم کلام،ظفر احمد صدیقی،ص ۲۳۴، جون ۱۹۹۶ء۔(۶) سہ ماہی فکرونظر،علی گڑھ، مدیر شہر یار،خلیق احمد نظامی،ادب اور مشرقی تاریخ کا مخزن-شبلی،ص ۱۱۱۔(۷) مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم،طبع دوم، ۱۹۵۰۔(۸) فراق۔اردو ہندی مسئلہ-۱،مترجم شمیم حنفی،فراق دیارشب کا مسافر، مرتبین شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی، ص ۲۱۹، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی۔(۹) مقالات شبلی ۷ بحوالہ سابق۔(۱۰) ایضاً،ص ۷۷۔(۱۱) ایضاً،ص ۷۸۔

فارم IV (رول نمبر ۸)

نام رسالہ: معارف، اعظم گڑھ

نام پریس: معارف پریس اعظم گڑھ نام پبلیشرز: عبدالمنان ہلالی

مقام اشاعت: دارالمصنّفین اعظم گڑھ قومیت: ہندوستانی

وقفۂ اشاعت: ماہانہ پتہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

نام پرنٹر: عبدالمنان ہلالی اڈیٹر: اشتیاق احمد ظلی

قومیت: ہندوستانی قومیت: ہندوستانی

پتہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ پتہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

نام و پتہ مالک رسالہ: دارالمصنّفین اعظم گڑھ

میں عبدالمنان ہلالی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عبدالمنان ہلالی

اخبار علمیہ

''لندن کے ۶؍آزاد مسلم نجی اسکولوں پر الزام''

ایک خبر کے مطابق لندن کے ٹاور ہیملٹس ریجن کے چھ مسلم اسکولوں مظاہر العلوم (سکینڈری)، جمیعۃ الامہ (سکینڈری)، ابراہیم اکیڈمی (سکینڈری)، لندن ایسٹ اکیڈمی (سکینڈری)، المیز ان (پرائمری)، ایسٹ لندن اسلامک (پرائمری) پر پچھلے دنوں آفسٹیڈ انسپکٹروں کی جانب سے الزام عاید کیا گیا ہے کہ آزاد ادارے اسلامی تعلیمات پر تو بہت زور دیتے ہیں لیکن قومی نصاب کے بنیادی اصولوں اور برطانوی معاشرت کے طور طریقوں کو پوری طرح نظر انداز کررہے ہیں۔ آرٹ، میوزک اور ڈرامہ جیسے مضامین کی طرف سے ان اسکولوں میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا اسکولوں میں مظاہر العلوم پر صرف اسلامی موضوعات پر توجہ، جمیعۃ الامہ پر طلبہ کو وسیع اور متوازن نصاب کی عدم فراہمی، ابراہیم اکیڈمی پر طلبہ کو جدید برطانوی معاشرت کے لیے تیار نہ کرنے اور نصاب کی تنگ نظری، لندن ایسٹ اکیڈمی پر بچوں کے عدم تحفظ اور لائبریری کی بیشتر کتابوں کے عربی میں ہونے، المیز ان پر مطالعہ مذاہب میں صرف مذہب اسلام کی جانب توجہ جیسے الزامات ہیں اور ایسٹ لندن اسلامک پر یہ الزام عاید کیا گیا ہے کہ ان کے زیادہ تر اسباق مطالعہ اسلام وعربی زبان وادب پر مرکوز ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے ایجوکیشن سکریٹری نے دھمکی دی ہے کہ ان اسکولوں نے اگر اپنے تدریسی منہج کو تبدیل نہیں کیا تو آفسٹیڈ کی جانب سے دی جانے والی مراعات بند کردی جائیں گی۔ حالانکہ مسلم اسکول سبھی شعبوں میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں اور ملک بھر میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والوں کی ایک نئی نسل کی پرورش کررہے ہیں۔ ان اسکولوں کی بدولت اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین میں کامیاب ہونے والے طلبہ کے تناسب کے پیش نظر برطانیہ کو ایسے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان مل رہے ہیں جو کام کے بنیادی شعبوں میں بہترین کارکردگی پیش کرنے والے ہیں۔ (اس خبر کی پوری تفصیل ''صراط مستقیم'' فروری ۲۰۱۵ء، ص ۲۰-۲۱ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

''منظوم ترجمۂ قرآن کا آڈیو''

۷۰ رسالہ نابینا شاعروموسیقار رویندر جین نے قرآن مجید کی منظوم آڈیو تیار کی ہے۔جلد ہی اس کے اجرا کی تقریب عمل میں لائی جائے گی۔جین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس پر ۲۲ رسال تک محنت کی ہےاوروہ چاہتے ہیں کہ لوگ قرآن حکیم کی آیات نغموں کے انداز میں سنیں۔آیات قرآنی کوشاعری کی شکل میں پیش کرنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کواس کی ہدایات سمجھنے میں آسانی ہو بعد میں مزید استفادے کے لیے وہ اردواور ہندی میں کتابی صورت میں لانے کی کوشش کریں گے۔(افکار ملی،فروری ۲۰۱۵ء)

''میگزین کے خلاف قانونی چارہ جوئی''

آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (اوآئی ایس) نے فرنچ میگزین Callie Hebdo کے خلاف اسلام مخالف کارٹونوں کی اشاعت کے جرم میں قانونی چارہ جوئی کا عزم ظاہر کیا ہے۔اس کے جنرل سکریٹری ایاد مدنی نے ایک عوامی روزنامہ کوانٹرویودیتے ہوئے کہا کہ اوآئی ایس یورپین اور فرنچ قوانین اور دوسرے قانونی طریقۂ کار کا مطالعہ کررہی ہے۔فرنچ میگزین کے اس مسلسل مذموم عمل کے خلاف تنظیم خاموش نہیں بیٹھے گی۔مدنی نے اپنے ٹوئٹر اکاؤنٹ میں لکھا ہے کہ اسلام مخالف کارٹونوں کی مسلسل اشاعت کسی لحاظ سے مناسب نہیں۔ اظہاررائے کی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی خاص مذہب کے خلاف نفرت کوفروغ دیا جائے اورقانون شکنی کی جائے۔(ینگ مسلم ڈائجسٹ،فروری ۲۰۱۵ء ص ۴۴)

''گائیڈ بک''

حال ہی میں امریکی مسلمانوں کے متعلق ایک رہنما کتاب شائع کی گئی ہے جس کا مقصد وہاں کے مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔اس میں اسلامی عقائدوعبادات کے مختصر تعارف کے بعدامریکی عوام کے ذہنوں میں اٹھنے والے ان سوالات کے متعلق جوابات ہیں جن سے اسلام کے باب میں خدشات اورغلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ جوابات خودامریکی

مسلمانوں نے دیے ہیں۔اس گائیڈ بک کو مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی امریکہ کے شعبۂ صحافت سے وابستہ طلبہ نے تیار کیا ہے، اس کا اجرا شعبۂ صحافت کے ڈین مسٹر کیٹ کرباٹ نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ امریکی مسلمانوں اوران کے دین کے حوالے سے مشتہر غلط فہمیاں امریکی عوام کے کچھ طبقات کے ذہنوں میں راسخ ہوچکی ہیں جن کا ازالہ ہر سطح پر ضروری ہے۔(صراط مستقیم، ص۳۰،فروری ۲۰۱۵ء)

''ہندوستانیوں کی موت کے متعلق ایک تحقیق''

عالمی ادارہ صحت نے ہندوستان کو سب سے زیادہ فضائی آلودگی والے ممالک کی فہرست میں رکھا ہے۔جس کا اندازہ ایک تازہ ترین اور چونکا دینے والے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ فضائی آلودگی کے سبب زیادہ تر ہندوستانی وقت سے تین سال پہلے مرجاتے ہیں۔ ہندوستان کی ٦٦ کروڑ آبادی ان علاقوں میں بودوباش کرتی ہے جہاں پارٹیکلیٹ میٹر یعنی باریک ذراتی مواد آلودگی ہندوستان کے محفوظ پیمانوں سے اوپر ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر ہندوستان اس صورت حال پر قابو پالیتا ہے تو اس کی نصف آبادی کی زندگی کے تقریباً ۲ء۳ سال بڑھ جائیں گے۔اس مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ فضائی آلودگی لوگوں کی قبل ازوقت موت کا سبب بن کر ترقی کو سست کررہی ہے۔اس کے علاوہ دیگر مطالعہ میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ فضائی آلودگی قوت پیداواری کو گھٹاتی ہے اور بیماری اور علاج کی دیکھ بھال کے اخراجات میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ ۲۰ آلودہ شہروں میں سے ۱۳ ہندوستان میں ہیں۔اورسانس سے متعلق بیماریوں میں سب سے زیادہ اموات ہندوستان میں ہوتی ہیں اور دہلی کو سب سے زیادہ آلودہ شہر ہے۔(تفصیلی رپورٹ ''اکنامک اینڈ پولٹیکل ویکلی'' کے حوالہ سے راشٹریہ سہارا میں شائع ہوئی ہے)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مخطوطہ خزانۂ عبادت

بنگلور

محترمی و مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف'' اعظم گڑھ کا تازہ شمارہ (جنوری ۲۰۱۵ء) نظر نواز ہوا، حسب روایات تمام مضامین لائق توجہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ خصوصاً محترم محمد طارق غازی (کناڈا) کا مقالہ ''قوم عاد کی تہذیب اور تباہی'' حیرت انگیز ہے۔ جناب انوار صمدانی امروہوی کا گراں قدر مضمون ''دکھنی اردو کا گوہرِ آبدار مخطوطہ خزانۂ عبادت'' بڑا وقیع ہے مگر مضمون نگار کو ''خزانۂ عبادت'' کے مصنف کے تعارف میں تسامح ہوا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''اس منظوم مخطوطہ کا نام، خزانۂ عبادت'' ہے اور اس کو نظم کا جامہ پہنانے والے سید شاہ محمد الحسینی چشتی ہیں'' (ص ۵۹)۔ اس عبارت کے بعد تذکرۂ اولیائے حیدرآباد مرتبہ سید مراد علی طالع (صفحہ ۱۴۳، جلد دوم) کے حوالے سے شاہ محمد الحسنی کا نسب نامہ بیان کیا اور مزید برآں یہ اطلاع بھی دی کہ شاہ محمد الحسینی کا مزار حیدرآباد (دکن) کے محلّہ لنگر حوض میں موجود ہے۔ حالانکہ ''خزانۂ عبادت'' کے مصنف مذکورہ بزرگ سید شاہ محمد الحسینی چشتی نہیں ہیں بلکہ حضرت سید شاہ محمد حسینی قادری آرکاٹی ابن حضرت سید شاہ میراں حسینی قادری ہیں۔ جو آرکاٹ کی ایک پہاڑی پر آسودۂ خاک ہیں۔ ''خزانۂ عبادت'' کے علاوہ شاہ محمد آرکاٹی کی ایک اور ضخیم مثنوی ''خزانۂ معرفت'' ہے، ان دونوں مثنویوں کے مخطوطے ''اورینٹل ریسرچ لائبریری میسور'' کے وقار میں اضافہ کررہے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے شاعر و محقق دوست اکرام کاوش میسوری کے ہمراہ ان کی زیارت کی تھی۔ علاوہ ازیں ''خزانۂ عبادت'' کے مزید تین نسخے ''انجمن ترقی اردو'' کراچی (پاکستان) میں موجود ہیں۔ ان میں ایک نسخے کی تفصیل بطور نمونہ پیش کی جارہی ہے۔

''مخطوطہ خزانۂ عبادت'' (۹×۶) سطر ۱۳ / جملہ صفحات ۸۶۸۔ کتابت نستعلیق، کاتب قاسم خان ولد احمد خاں، مقام کتابت کڈپہ (آندھرا) یہ نسخہ کریم الاخلاق محمد آبدار خان ابن غلام خان ساندوری کی فرمائش پر تحریر کیا گیا۔ سن کتابت ۱۲۷۴ھ۔ ہر باب کا عنوان اوراس کا پہلا شعر سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ (فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو، کراچی، جلد دوم، ص ۷۳ تا ۷۷، مرتب افسر صدیقی امروہوی، سال اشاعت ۱۹۶۷ء) ''خزانۂ عبادت'' کے مصنف نے اپنے اشعار میں سال تصنیف ۱۱۶۵ھ کی وضاحت کردی ہے۔

کتاب یو بنیا تو یو جانو عزیز
سن ہجری ہزار ہور یکسو پہ نیز
گذر جا کو پینسٹھ جو برساں سگل
لگا تیسرا مہینہ ربیع الاول (ص ۷۳)

اس واضح دلیل کی روشنی میں محترم مضمون نگار کی دی گئی تفصیل غلط ٹھہرتی ہے کہ ''خزانۂ عبادت'' کا سنہ آغاز ۱۱۴۰ء اور سنہ اختتام ۱۱۹۹ھ ہے۔ مثنوی کی اندرونی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تحریر کے وقت مصنف کے والدین حیات تھے اور مصنف صاحب اولاد بھی تھے۔ (الٰہی مرادین وایماں سنبھال ...... بھی ماں باپ کا بھی یوں رکھنا بحال) اور مصنف نے یہ بھی واضح کردیا کہ انھوں نے اس مثنوی میں شعروسخن کی پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ان کا مطمح نظر صرف فقہی مسائل کو منظوم کرنا ہے۔ شاہ محمد آرکاٹی کی دوسری مثنوی ''خزانۂ معرفت'' ۱۱۸۱ھ میں رقم کی گئی جس کا ایک نسخہ ''انجمن ترقی اردو'' کراچی کی زینت بڑھا رہا ہے اور دوسرا نسخہ ''سالار جنگ کتب خانہ'' میں موجود ہے۔ فہرست مخطوطات سالار جنگ کے مرتب مولوی نصیر الدین ہاشمی نے مذکورہ مثنوی کے حوالے سے مصنف کے نام کے ساتھ ''قادری'' لکھا ہے اور مصنف کی ولدیت بھی بیان کی ہے۔ موجودہ دور کے ماہر دکنیات پروفیسر ڈاکٹر محمد علی اثر نے راقم کے استفسار پر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ''خزانۂ عبادت'' اور ''خزانۂ معرفت'' کے مصنف سید محمد شاہ حسینی قادری آرکاٹی اوران کے والد حضرت سید شاہ میراں حسینی قادری آرکاٹی ہیں نہ کہ سید شاہ محمد الحسینی چشتی ابن سید شاہ امین الدین علی چشتی رضوی جن کا ذکر فاضل مضمون نگار جناب انوار صمدانی امروہوی

نے اپنے مضمون کی ابتدا میں کیا ہے۔(''معارف'' جنوری ۱۵ء،ص ۵۹)۔شاید ناموں کی بظاہر یکسانیت کے سبب انہیں مغالطہ ہوا ہے۔

شاہ محمد آرکاٹی کے والد ماجد اور پیرومرشد شاہ میراں حسینی منزوی الجبلین سلسلۂ بندہ نواز گیسودرازؒ کے مشاہیر شیوخ میں سے تھے، بندہ نوازی اکابر کی طرح انہوں نے بھی رشد و ہدایت کے لیے تصنیف و تالیف کو وسیلہ بنایا تھا۔''خلاصۃ الرویۃ'' اور رسالہ ''سبع صفات'' ان کی تصانیف ہیں۔بقول مصنف جواہرات میسور ڈاکٹر حبیب النساء صاحبہ ''آپ اکثر آدم کی پہاڑی پر مصروف ریاضت و محو عبادت رہتے تھے۔(یہ پہاڑی آج بادم کی پہاڑی کے نام سے مشہور ہے جو شہر آرکاٹ، تمل ناڈو کے مضافات میں مغرب کی سمت واقع ہے)۔منزوی الجبلین کے لقب سے اس لیے معروف ہوئے کہ وہ دو پہاڑیوں کے درمیان واقع درے میں قیام پذیر تھے۔ان کا مزار بھی اسی مقام پر ہے۔راقم نے اپنے تاجر دوست سید سلیم ویلوری کی معیت میں بادم پہاڑ پر چڑھ کر ''منزوی الجبلین'' کی تربت دیکھی ہے۔اس پہاڑی زاویہ پر ایک بڑی سی چٹان کی چھت ہے جسے مخالفین نے قتل کرنے کے ارادے سے ان پر ڈالنا چاہا تھا، مگر خدائے تعالیٰ کا فضل ایسا ہوا کہ انہوں نے چٹان کو اپنے ہاتھ پر روک لیا، قدرت کا کرشمہ ہے کہ ہاتھ کا نشان آج بھی اس چٹان کی اندرونی سطح پر نقش ہے۔حضرت شاہ میراں حسینی کے دو فرزندوں میں سے بڑے صاحبزادے شاہ محمد آرکاٹی اور دوسرے فرزند رسالہ ''مراۃ الاذکار'' کے مصنف حضرت سید شاہ صدرالدین نلمنگلی ہیں۔والیٔ آرکاٹ نواب سعادت اللہ خان (م ۱۷۳۲ء) نے نلمنگل علاقہ کرناٹک کے سات قریے بطور جاگیر شاہ میراں کی خدمت میں پیش کیے تھے، انہوں نے آدم پہاڑی سے نقل مکانی نہیں کی مگر شاہ صدرالدین کو اشاعت دین کی خاطر نلمنگل منتقل ہونے کا حکم دیا۔چنانچہ شاہ صاحب نے اپنی حیات مستعار کو اسی علاقے کے لیے وقف کر دیا اور وہیں وہ اپنی آخری آرام گاہ میں آسودہ ہیں۔راقم نے اپنے مقالے ''وشارم میں اردو کے تاریخی آثار'' میں دیگر معلومات کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

والسلام

(جناب) راہی فدائی

وفیات

آہ! ڈاکٹر کلیم احمد عاجز مرحوم

جناب عبدالمتین منیری

دیکھیے میری غزل میں کبھی صورت اپنی　　یہ وہ آئینہ ہے کہ جو آپ نے کم دیکھا ہے

اس شعر کے خالق اور عظیم آباد کے تہذیبی گھوارے کے نمایاں حدی خواں اور میر تقی میر کی شعری روایت کے امین، عظیم شاعر و ادیب ڈاکٹر کلیم احمد عاجز اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے ساتھ وضع داری، اخلاق و رواداری کی ایسی روایات لے گئے، جو شاید اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گی۔ ان کی رحلت کے ساتھ اردو شعر کا جو خسارہ ہوا ہے مدتوں اس کا احساس رہے گا، ان کی ولادت ۱۹۲۰ء کو پٹنہ میں ہوئی تھی، اس طرح انہوں نے طویل عمر پائی جس طرح موسی ندی کی طغیانی اپنے ساتھ شاعر رباعیات امجد حیدر آبادی کے پورے اہل خانہ کو بہا لے گئی تھی، کچھ اس سے بھی زیادہ بھیانک انداز میں تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ برپا ہونے والے فسادات کی آگ نے عاجز صاحب کے خاندان کے سبھی افراد کو اپنی لپٹوں میں لے کر راکھ کر دیا تھا۔ ۵؍ نومبر ۱۹۴۶ء کو عیدالاضحیٰ کے روز ان کی والدہ اور چھوٹی دونوں کا قتل ہوگیا۔ یہ ایک ایسا حادثہ جانکاہ تھا کہ جس کے غم نے اردو ادب کو (وہ جو شاعری کا سبب ہوا) کی غزلوں کے مجموعے کے ساتھ اس کے مقدمہ کی شکل میں نثری اور سوانحی ادب کا ایک شہ پارہ دے دیا اور یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ کلیم صاحب شاعر بڑے تھے یا نثر نگار۔

پے در پے غموں اور تنہائی کے کرب و درد نے کلیم عاجز کو میر تقی میر کا پرسوز لہجہ عطا کر دیا ان کے اشعار دوسروں کو سنانے اور داد تحسین حاصل کرنے کے لیے نہیں تھے، نہ وہ محض میر کی نقالی تھے بلکہ دل سے اٹھنے والے وہ جذبات تھے جو دوسرے کے دلوں کو تڑپانے والے تھے، چونکہ یہ

بھٹکل، مقیم دبئی۔

جذبات حقیقی اور اصل تھے اس لیے دوسروں نے جب کلیم عاجز کی مقبولیت سے متاثر ہوکر نقل کرنی چاہی تو مشفق خواجہ جیسے نقاد نے کہا کہ یہ اسلوب صرف کلیم عاجز ہی کے لیے خاص ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری ٹوٹے دلوں کی آواز بن گئی۔ ان کے اشعار اور ان کی تلمیحات مظلوموں کے دل کی پکار بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی ظلم کے اندھیرے چھائے، معصوموں کا خون ناحق بہا اور درندگی کا بہیمانہ رقص کیا گیا، ان کے خلاف آواز اٹھنے میں کلیم عاجز کے اشعار جس طرح دہرائے گئے اس کی مثال اور شاعروں کے ہاں نہیں ملتی۔ واقعی عظیم شاعر وہی ہے جس کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جائیں اور دوسروں کے دل کے ترجمان بن جائیں۔ حقیقتاً عاجز صاحب کی رحلت شعر و ادب کے ایک دور کا خاتمہ ہے۔

کلیم عاجز صاحب کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ شاعر و ادیب ہوتے ہوئے دینی اقدار کے امین تھے، وہ عرصہ تک صوبہ بہار میں تبلیغی جماعت کے امیر رہے۔ وہ اسلام کے پیام انسانیت کی آفاقیت کے قائل اور اور عامل تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی اعلیٰ قدروں کو دنیا کے تمام افراد تک پہنچانا ادیبوں اور شاعروں کا بھی فریضہ ہے لیکن اس کے لیے اسلام کو محض لیبل کے طور پر پیش کیا جانا ضروری نہیں کہ اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا طبقہ اسلام کا نام سن کر ان اقدار کو جانے بغیر ہی ان میں عین میخ نکالنے لگتا ہے۔ میرے نزدیک وہ ادب میں حلقہ بندیوں کے مخالف تھے، ان کا کہنا تھا کہ اردو زبان کسی ایک دین کے ماننے والوں کی جاگیر نہیں ہے، اسے غیر مذہب کے لوگوں نے سنوارنے اور مقبول بنانے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا، اردو بولنے والے غیر مسلموں میں ایسے افراد کی بڑی تعداد رہی ہے جو حد بندی کے بغیر اسلامی و مشرقی اقدار کی پابند رہی ہے۔ اب گنگا جمنی کی صفت اس زبان سے اگر ختم ہوتی جا رہی ہے تو اس کے اسباب پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ غیر اقوام میں اردو زبان کی ترقی میں حصہ لینے والے پیدا کم کیوں ہو رہے ہیں انہوں نے طویل عرصہ تک پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے اردو کے فروغ میں حصہ لیا۔ اس طرح وہ جمیل مظہری کے جانشین بنے۔ آخر میں ان کے قلم سے کئی کتابیں ''جب فصل بہاراں آئی تھی، پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا، جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، ابھی سن لو مجھ سے، کوچہ جاناناں، مجلس ادب، دیوانے دو، میری زبان میرا قلم، دفتر گم گشتہ'' وغیرہ نکلیں۔

ہم نے ان کو پہلی بار ۱۹۸۱ء میں دبئ شیرائن ہوٹل میں منعقدہ ایک عالمی مشاعرے میں دیکھا تھا، معیار اور استاذ شعرا کی شرکت کی وجہ سے ایسا مشاعرہ پھر دیکھنا نصیب نہیں ہوا، حالانکہ اس کے بعد دبئ میں منعقد ہونے والے تقریباً سبھی عالمی مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا، اس وقت ان کے پیش کردہ کلام کی ریکارڈنگ ہماری ویب سائٹ اردو آڈیو ڈاٹ کام میں سنی جاسکتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام (وہ جو شاعری کا سبب ہوا) شائع ہوا تھا۔ اس پر فراق گورکھپوری نے فلیپ لکھا تھا، اس کا اجرا صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ہوا تھا لیکن یہ ایڈیشن عام قاری کی دست رس سے باہر رہا اور زیادہ تر افراد اس کتاب سے ناواقف ہی رہے، اس کا اہم سبب کلیم عاجز کا اس کے تئیں رویہ بھی تھا، ہوا یہ تھا کہ کتاب کی اشاعت میں ان کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، گرچہ احباب ان کے کلام کو ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے، عاجز صاحب ایسی روایت کے امین تھے جہاں کاروباری ذہنیت معیوب تھی، وہ چاہتے تھے کہ ان کا کلام ان افراد کے ہاتھوں تک پہنچے جن کے پاس کلام کی اہمیت ہو اور ہر قیمت پر وہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار ہوں، لہٰذا کتاب بڑے اعلیٰ معیار پر محدود تعداد میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، اس کا ہدیہ عام قاری کی قوت خرید سے باہر تھا، دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے بڑی قیمت دے کر اسے خریدا اور اپنے جملہ مرکزی کتب خانوں کی زینت بنایا، عام قاری اس سے محروم ہی رہے۔ قریب دو سال بعد اس کے ایک اور محدود تعداد میں خوبصورت ایڈیشن کا دبئ میں اجرا عمل میں آیا، یہ بھی ناپید ہوگیا لیکن ان کے کلام کی خوشبو مشک وعنبر کی طرح فضاؤں میں پھیلی تھی، وہ چاہتے تو اپنے مجموعہ سے دولت کما سکتے تھے لیکن انہیں دولت سے زیادہ اس کی قدر وعزت اور اس کے لیے ہونے والی تڑپ عزیز تھی، اس کے بعد ان کے مضامین کا مجموعہ جہاں (خوشبو ہی خوشبو تھی) اور دوسرا مجموعہ کلام (جب فصل بہاراں آئی تھی) شائع ہوا تو خوش قسمتی سے اس وقت اردو بک ریویو دہلی میں آرہ کے پروفیسر رضوان اللہ صاحب نے اس پر بہت خوبصورت تبصرہ لکھا، جس سے عاجز صاحب کی کتابوں تک رسائی کا ایک ذریعہ مل گیا، اس مجموعہ کی قیمت بھی زیادہ تھی لیکن ہم نے اس کے کئی نسخے دبئ کے پتے پر منگوا لیے اور عاجز صاحب سے ربط وتعلق اور مراسلت کی ایک راہ نکل آئی۔

اس وقت صرف ہمارے دوست ہی نہیں بلکہ بزرگ مرحوم مولانا محمد رضوان القاسمی

صاحب بانی مہتمم جامعہ سبیل السلام حیدرآباد بقید حیات تھے، اللہ تعالیٰ نے علم دین کے ساتھ بڑا صاف ستھرا ادبی ذوق انہیں دیا تھا، جید صاحب قلم، ایک زمانے میں حیدرآباد سے نوید دکن نکالا تھا، پھر سیاست میں ہفتہ وار کالم لکھا کرتے تھے، جب دبئی میں آتے تو رمضان میں تراویح کے بعد ہمارا مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا تو سحری کا وقت ہونے کا پتہ نہیں چلتا تھا، انہوں نے ہم سے کہا کہ (وہ جو شاعری کا سبب ہوا) لوگ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن عاجز صاحب اسے چھپوانے کے لیے تیار نہیں، اس کے لیے ہمارا تعلق بھی کام نہیں آرہا ہے۔ سبیل السلام میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار ہونے جارہا ہے، اگر اس کی اشاعت کے لیے کوئی ڈول ڈال سکتے ہوں تو آپ کی کرامت سمجھوں گا۔

کہاں بھٹکل کہاں دبئی اور پٹنہ، عاجز صاحب سے ہماری شناسائی صرف ان کی کتابیں پڑھنے اور کلام سننے کی حد تک تھی، بہرحال ہم نے عاجز صاحب کو خط لکھا تو فوراً رضوان صاحب کے توسط سے کتاب کی اشاعت پر راضی ہوگئے اور ان کے پاس اپنی کتاب کا جو اکلوتا نسخہ تھا وہ اور کتاب کے پہلے ڈیلکس ایڈیشن کی پلیٹیں ڈاک سے بھیج دیں، کہاں یہ رویہ کہ دبئی سے چھپے نسخہ کی قیمت پانچ سو درہم کہ ہم جیسا کوئی اسے خریدنے کا سوچے بھی نہیں اور مال کے تعلق سے شاعر موصوف کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو اور کہاں یہ بے نیازی بہرکیف رضوان القاسمی مرحوم کا شائع کردہ یہی نسخہ ہندوستان میں عام قاری کے ہاتھوں تک پہنچا، ہمارا خیال ہے کہ طلب کے باوجود گذشتہ پندرہ بیس سال میں اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن نہیں نکلا۔ یہ کتاب کلیم عاجز کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ کتاب کی اشاعت کے چند ہی دنوں بعد ۱۹۹۷ء میں پچاس سالہ جشن آزادی کے موقع پر بھٹکل میں نوجوانوں کی تنظیم وائی ایم ایس ایم نے سیرت کوئز اور نعت کا ایک مقابلہ رکھا، جس کے لیے عاجز صاحب کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی، خوش قسمتی سے ہمیں بھی اس موقع پر ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ خوب چہکے، عادت کے برخلاف بہت سارا کلام مجلسوں میں سنایا، طلبہ و اساتذہ سے بھی خوب گھل مل گئے، ایسا لگا کہ جیسے اپنے ہی گھر میں آئے ہیں، جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں پہانی، ہردوئی کے ہمارے حافظ کبیرالدین صاحب وغیرہ اساتذہ کی محنت سے ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس میں طلبہ نے ان ہی کا کلام بڑے خوبصورت

لب ولہجہ میں پیش کیا، بھٹکل میں وہ اتنے خوش ہوئے کہ ایک ایک پرانے محلے اور مسجد کا غور سے مشاہدہ کیا، اتنی اپنائیت کا اظہار کیا کہ ہمیں خجالت سی محسوس ہونے لگی، اپنی کتابیں بھی طلبہ میں بڑی مقدار میں مفت بانٹیں، یہاں ان کی مال و دولت سے بے نیازی، فقیرانہ قلندرانہ زندگی۔ عبادت وللّٰہیت میں مگن ایک ایسی شخصیت کا مشاہدہ سامنے آیا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عظیم شاعر کی ایسی پاکیزہ زندگی کسی اور شاعر میں پھر شاید ہی دیکھنے کو ملے، کلیم عاجز کے اٹھ جانے سے نہ صرف اردو دنیا ایک عظیم سرمایہ سے محروم ہوئی بلکہ ایک ایسے اہل اللہ اور داعی سے بھی ہماری سرزمین خالی ہوگئی ہے، جن کی موجودگی اللہ کے بہت سے عذابوں سے حفاظت کا سبب بنتی ہے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین

آثار علمیہ و تاریخیہ

علامہ شبلی نعمانی کی ایک تقریظ

ڈاکٹر عارف نوشاہی

گذشتہ جنوری ۲۰۱۵ء میں راقم السطور کو فارسی قواعد زبان پر ایک اردو کتاب ''دستور نامۂ فارسی'' کے بارے میں ایک ایرانی انسائیکلوپیڈیا ''دانش نامۂ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ'' (ناشر: فرہنگستان زبان و ادب فارسی، تہران) کی فرمائش پر ایک مقالہ لکھنے کا موقع ملا۔ میں نے یہ کتاب کوئی تیس سال پہلے بھی دیکھی تھی جب یہاں اسلام آباد کے کتب خانۂ گنج بخش میں موجود فارسی کتابوں کی فہرست تیار کر رہا تھا اور اس کا مختصر تعارف اپنی کتاب ''فہرست کتاب ہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتاب خانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد'' مطبوعہ ۱۹۸۶ء کی پہلی جلد، صفحہ ۳۳۹ میں درج کیا تھا۔ میں نے تب بھی اپنی اس فہرست میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ اس کتاب پر علامہ شبلی نعمانی کی تقریظ موجود ہے۔ آج جب اس کتاب پر مقالہ لکھنے کا موقع نکلا تو ایک بار پھر یہ تقریظ آنکھوں کے سامنے آئی تو اس سے مفر نہ ہو سکا اور ارادہ کیا کہ دیگر قارئین کو بھی اس کی قرأت میں شریک کیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم آیا علامہ شبلی کی متفرق تحریریں، دیباچے، تقریظیں وغیرہ کسی نے جمع کیے ہیں اور زیر بحث تقریظ کسی ایسے مجموعے میں شامل ہے؟ اگر کوئی محقق اس کام کا بیڑا اٹھائے تو یہ مختصر تقریظ اس کے لیے کارآمد ہوگی۔

تقریظ بلفظہٖ نقل کرنے سے پہلے، دستور نامہ فارسی کا مختصر تعارف لازم ہے۔ یہ مولوی حکیم حسین شریف بنگلوری کی تصنیف ہے جو شاعری میں ''حکمی'' تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں قلندر حسین متخلص بہ ''اطہر'' اور دیگر علوم میں مولانا ابوالخیرات سید احمد دہلوی مدرس اول مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کے شاگرد تھے۔ کتاب کے سرورق پر مصنف کی مکانی نسبت اگرچہ ''بنگلوری'' لکھی ہے لیکن کتاب کی پشت پر چھپے ایک اعلان میں ان کا پتہ گلزار حوض، حیدرآباد دکن درج ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک دوست منشی محمد عبداللہ الحسین الخلیل، صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ بنگلور کی فرمائش پر

ادارۂ معارف نوشاہیہ، ہمک، اسلام آباد۔

۱۳۱۰ھ/۹۳-۱۸۹۴ء میں تصنیف کی اور یہ آٹھ سال بعد ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں مطبع مجتبائی، دہلی میں طبع ہوئی اور ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے حکمی بنگلوری فارسی علم صرف پر ایک کتاب ''زرمشت افشار'' لکھ چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی علمی شہرت اچھی تھی۔ اسی لیے کہ ان کی کتاب دستور نامۂ فارسی پر اس عہد کے کچھ نامور علما کی تقریظیں اور شعرا کے قطعات تاریخ بھی چھپے ہیں جن میں مصنف کی قابلیت کی تعریف کی گئی ہے۔ تقریظ نگاروں میں مولانا رشید احمد گنگوہی (اردو)، مولانا ابوالخیرات سید احمد دہلوی (اردو)، مولانا محمد ذوالفقار علی (اردو)، آقا سید علی بن سید ابوالحسن شوشتری جزائری (عربی و فارسی) حاجی مولوی محمد ضیاء علی (عربی و فارسی) اور علامہ شبلی نعمانی (اردو) شامل ہیں۔ شعرا سے: مولوی محمد عبداللہ الحسینی الخلیل (اردو)، محمد ابراہیم خان واصف بنگلوری (اردو)، مولوی خلیل الرحمٰن ''خلیل'' برہان پوری (فارسی، اردو)، حافظ حفیظ اللہ ''فانی'' اعظم گڑھی (فارسی، اردو)، مولوی حافظ عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی (اردو)، مولانا نظام الدین ''عشق'' کیرانوی کاتب مطبع مجتبائی (عربی)، محمد بیگ منیجر مطبع مجتبائی (فارسی)، محمد عبدالجبار خان ''آصفی'' ملکاپوری (فارسی) و حکمی بنگلوری مصنف (فارسی)۔ ان قطعات تاریخ کو دیکھ کر مجھے ایک اور بات معلوم ہوئی کہ پہلے زمانے میں مطبع / چھاپہ خانہ کا ادارہ بھی اہل علم کا مجمع ہوتا تھا۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ مطبع مجتبائی کے مالک، منیجر اور کاتب تینوں شاعر ہیں۔

دستور نامۂ فارسی اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت جامع کتاب ہے، جس کا اندازہ اس کتاب کے آغاز میں ۱۶ صفحات کی فہرست ابحاث (مضامین) سے ہوتا ہے۔ مصنف نے ہر بحث میں شواہد و نظائر پیش کیے ہیں اور بہت محنت کی ہے۔ اس قدر محنت کہ علامہ شبلی بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ لیجیے علامہ کی تقریظ ملاحظہ فرمائیں:

تقریظ فاضل جلیل و حبر نبیل، شمس العلما، مولانا شبلی نعمانی، ناظم علوم و فنون سرکار عالی نظام حیدرآباد دکن و سابق پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ و فیلو یونیورسٹی الہ آباد۔

''میں نے جناب مولوی حسین شریف صاحب کی کتاب دستور نامہ فارسی اکثر جگہ سے بغور دیکھی۔ کوئی شبہہ نہیں کہ یہ کتاب ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ مصنف نے مشکل اور اہم مسائل کو بڑی بسط اور تنقید سے لکھا ہے۔ بہت سے اصول اور قواعد خود بھی ایجاد کیے ہیں۔ مصنّفین سابق سے جا بجا اختلاف بھی کیا ہے اور وہاں بہت زیادہ زور طبع دکھایا ہے۔ اس قدر ہے کہ یہ کتاب بہ وجہ دقت مضامین کے، منتہیوں کے قابل ہے۔ تشبیہ کی بحث اس میں استطراداً موضوع سے خارج آ گئی ہے۔ بہر حال یہ کتاب ہر طرح سے قدردانی کے مستحق ہے۔ شبلی نعمانی، ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء''۔ (ص ۲۹۲)

ادبیات

غزل

جناب جمیل مانوی ☆

ہم سفر تھا کون، سیر رنگ و بو کرتے ہوئے
عرش تک پہنچیں نگاہیں جستجو کرتے ہوئے

سو بہاریں، اک ترے حسن تکلم پر نثار
ذہن کھل اٹھتا ہے تجھ سے گفتگو کرتے ہوئے

زندگی کے تلخ و شیریں تجربوں کے درمیاں
دل بہت ڈرتا ہے تیری آرزو کرتے ہوئے

جو گذرنی تھی وہی گزری دل برباد پر
زندگی کو آئینوں کے روبرو کرتے ہوئے

آؤ دیوانو، ذرا مقتل میں دیکھیں تو سہی
جوئے خوں گذری ہے کس کو سرخ رو کرتے ہوئے

بس جنوں یہ تھا، بزرگوں کا بھرم قائم رہے
عمر کا ہر پل کٹا، چادر رفو کرتے ہوئے

خود اسے بھی میں نے اپنا منتظر پایا جمیلؔ
جب میں پہنچا، اس کے در تک جستجو کرتے ہوئے

قطعہ تاریخ وفات، جناب کلیم عاجز مرحوم

جناب وارث ریاضی ☆☆

شاعری نے تیری پائی ہے بہ فیضِ غم جلا
جن مراحل سے تو گزرا تھے بڑے ہمت شکن

باوجود انہماکِ خدمتِ شعر و ادب
دین کی تبلیغ کی بھی تھی تجھے سچی لگن

تیری رحلت پر حزیں دین و ادب کے پاسباں
محوِ غم، گریہ کناں ہر ایک بزمِ علم و فن

شد بہ فردوس بریں در دو ہزار و دہ و پنج
آں کلیمِ نیک سیرت، روحِ ارباب وطن

۲۰۱۵ء

☆ سہارن پور۔

☆☆ کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

محفل قرآن جلد سوم : از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۷۲، قیمت ۳۶۰ روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱، نظیر آباد، لکھنؤ۔

قرآن مجید کے مطالب و معانی ایک ایسے جہان بلکہ کائنات کے مانند ہیں جس کے اسرار کے اظہار کا سلسلہ کبھی تھمنے یا ختم ہونے والا نہیں، خالق ارض وسماوات کی تنزیل ہونے کی خصوصیت یوں ہی تو نہیں، اسی لیے قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر کوشش، قریب پندرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہی کہتی نظر آتی ہے کہ "جانکاہ کاوشوں" کے باوجود حق یہی ہے کہ حق ادا نہیں ہوا، ہر صاحب نظر کی گزرگاہ فکر و معرفت میں ایسے مقامات برابر آتے رہتے ہیں جہاں کسی نئے رازی سے گرہ کشائی کی توقع ہونے لگتی ہے۔ مطالعۂ قرآن مجید کا زیرنظر سلسلہ اسی احساس کا نتیجہ ہے، اس سے پہلے اس کی دو ابتدائی جلدوں یا محفلوں کو سجایا گیا اور ان کا ذکر ان سطور میں کیا بھی گیا، اب یہ تیسری محفل ہے جو انعام، اعراف اور انفال کی سورتوں کے مضامین سے آراستہ ہے۔ محفل کی نسبت سے دیکھا جائے تو اس میں واعظانہ لب و لہجہ ہونا ہی چاہیے اور شاید اس کے لیے تذکرہ لمن یخشی کی صفت بھی فاضل ترجمان قرآن کے پیش نظر رہی، تفسیروں کا عام انداز اور پیش کش کی روش اس میں نظر نہیں آتی تو غالباً اس میں محفل کی معنویت کو دخل ہے، زبان و بیان کی سلاست اور شگفتگی اور دل کشی، اثر انداز ہونے کی بنیادی خوبیاں ہیں اور جب یہ بیان قرآن کا مزاج شناس ہو تو محفل کی گرمی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ایسے میں جب نکتے سامنے آتے ہیں تو لطف کچھ اور سوا ہو جاتا ہے **ما علیک من حسابھم من شی وما من حسابک علیھم من شی** پڑھتے وقت اگر نگاہ **ان حسابھم علی ربی لو تشعرون** پر جائے اور سمجھ میں آجائے کہ یہ حساب کی بات تو باطن کے معاملہ کی ہے تو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی لذت دوبالا

ہو جاتی ہے۔ سورہ انفال، غزوۂ بدر کے بپا ہونے اور اسے یوم الفرقان قرار دیے جانے کی حکمتوں سے پر ہے۔ یہ محض معرکہ یا جنگ نہیں، اس کے لیے یہی عنوان ہی زیب داستان ہوسکتا ہے کہ ''معرکہ یوم الفرقان تمام تر حکمت الٰہی کی کارفرمائی تھی'' لیکن یہ تاریخ کے سلسلۂ روز وشب کا ایک حصہ بھی ہے اس لیے مفسرین ومحدثین ومورخین سب کی نگاہوں میں جتنے ابعاد ممکن ہیں نظر آتے ہیں، اس محفل میں جب یہ مقام آیا تو عام رنگ کچھ دیر کے لیے اس خاص رنگ میں بدل گیا جو محقق کو واعظ سے جدا کرتا ہے، آلآن خفف اللہ عنکم الخ میں بیس بمقابلہ دوسو اور سو بمقابلہ ایک ہزار کا تناسب آیا تو فاضل ترجمان قرآن نے اسے خبر و بشارت کے اس انداز میں دیکھا کہ یہ بشارت میں فرضیت کی خبر ہے۔ قرآنیات کے جدید مطالعہ کرنے والوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ چونکہ تربیت ابھی خام تھی اس لیے یہ حکم نازل ہوا، کفار کے اسیران بدر اور ان کے فدیہ کا معاملہ رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحاب کرامؓ کے لیے سخت آزمائشی لمحہ تھا یا نہیں، اس سے قطع نظر یہ مفسرین کے لیے یقیناً سخت مقام ہے، صاحب محفل کی نظر سب سے بہتر حل کی تلاش میں بجا طور پر قرطبی پر پڑی جس سے بعض معاصر تفسیروں کی بے احتیاطی بھی کھل گئی، مولانا سنبھلی نے ان معاصر تفسیروں کی صراحت نہیں کی اور اس لیے نہیں کی کہ ''کوئی بحث مقصود ہی نہیں تھی'' شاید لکھنوی آداب تہذیب نے اس کی اجازت نہیں دی، معرکہ بدر میں قافلہ تجارت کے مقصود اول ہونے کی بحث بھی مفسرین اور مورخین دونوں کے نزدیک اہمیت اور نزاکت کی حامل ہے کہ مقصد کاروان تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا، علامہ شبلی نے بھی سیرۃ النبیؐ میں خاص بحث کی، خاص یوں کہ بقول علامہ ''فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑا'' مولانا سنبھلی نے اختلافات رائے کا اظہار کیا لیکن خدا جانے کیوں مولانا کی تحقیق پر گفتگو سے پہلے انہوں نے (شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ) سے معذرت کی ضرورت سمجھی اور ہاں ان کے سوالوں کے لیے یہ تعبیر لغوی طور پر کیا درست ہے کہ یہ (سوالات) مولانا شبلی کے موقف پر سر اٹھاتے ہیں؟ سر اٹھانے کا یہ محاورہ کہیں انگشت نمائی تو نہیں کر رہا؟ ایک بحث میں حضرت عقیل بن علیؓ بن ابی طالب دو جگہ لکھا گیا، یہ حضرت عقیل کیا حضرت علیؓ کے چچا کے علاوہ کوئی اور ہیں؟

رجوع الی القرآن اہمیت اور تقاضے: مرتب مولانا اشہد رفیق ندوی،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۲۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز ۱۰/اعظمی اپارٹمنٹس، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ اور البدر بک سینٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی۔

قرآن مجید سے اکتساب نور اور فیضان ہدایت کے سرور کو حاصل کرنے اور موجودہ عالم بشریت کے بڑھتے امراض سے نجات پانے کے لیے نسخہ شفا کی یافت کی مبارک کوششوں کا ایک حصہ یہ مجموعہ مقالات بھی ہے جو عرصہ سے علوم قرآنیہ کی ترویج وتبلیغ کے لیے کوشاں ادارہ علوم القرآن کے ایک سمینار کا حاصل ہے، قریب پچیس عمدہ مقالات اس سمینار میں زیر سمع وبحث آئے، لائق مرتب نے ان کو کلیدی مباحث، تعارف قرآن، رجوع الی القرآن، تعلیم وتعلم، وسائل فہم قرآن، عصر حاضر میں قرآن جیسے ذیلی عناوین کے تحت بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا، مقالہ نگاروں کی فہرست میں معتبر، مستند اور ممتاز علماء واہل دانش کے نام شامل ہیں۔ رجوع الی القرآن کے درجات کا تعین خوبی سے کیا گیا کہ اول تو یہ درجہ ہدایت طلبی کا ہے، پھر اثر پذیری اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کا مرکزی موضوع انسان ہے کہ وہ کس طرح خالق کائنات کا صحیح فرماں بردار بندہ بن سکتا ہے۔ یہ بھی پیغام ملا کہ قرآن مجید کے بڑے حصے کو دوسروں پر منطبق کرنا بڑی نادانی ہے کہ خود کو اس کے فیض ہدایت سے محروم کرلیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان، ہر آیت قرآن کو اپنے سے متعلق سمجھے۔ ایک جگہ عموم کے لہجے میں کہا گیا کہ مستشرقین اور اسلام کے مخالفین کو بھی اس کی حقانیت کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ شاید مبالغہ یا مغالطہ انگیز ہے۔ ایک مقالہ میں رجوع الی القرآن کو نئے نعرہ یا نئی دعوت سے تعبیر کرنے میں احتیاط کا مشورہ دیا گیا کہ سلف سے خلف تک ہر دور میں قرآن کی طرف رجوع کا پیغام دیا جاتا رہا ہے، خیر القرون میں یہی پیغام، اعتصام بالکتاب والسنہ یا تمسک بالقرآن والحدیث سے تعبیر کیا گیا۔ یہ کہہ کر بروقت اس فتنہ سے آگاہ کیا گیا، جس کے پردہ میں سنت وحدیث کو غیر قرآن یا غیر مقصود اور دخل در معقولات جیسے خیالات ظاہر کیے جاتے ہیں، یہ بالکل درست کہا گیا کہ ''کتاب وسنت یا قرآن وحدیث کا تعلق لازم وملزوم کا ہے، دونوں وحی الٰہی کی مشکوٰۃ سے برآمد ہوئے ہیں''۔ رجوع الی القرآن کی دعوت دینے والے سمینار میں جہاں زیادہ تر اہل فکر وقلم مدرسہ اور اس کی تعلیم کے پروردہ تھے لیکن اس میں یہ بھی کہا گیا کہ ''تمام دینی ادارے تعلیم قرآن سے یکسر

غافل ہیں، تفسیروں کی خواندگی اور ہے قرآن پاک کی تعلیم کچھ اور ہی چیز ہے'' سمیناروں میں خیالات کا تنوع ظاہر ہے اختلافات وتضادات کا منکر نہیں، اس کے فائدے بھی ہیں لیکن اثم اکبر من نفع کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غور وفکر کی کچھ نئی راہیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ اسی خوبی کا نمونہ ہے۔

نگارشات: ازمولانا محمد عاصم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۴۸۰، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: کمال بک ڈپو، جامعہ شمس العلوم، گھوسی، مئو، یوپی۔

نگارشات کے اس مجموعہ میں سیرت، تاریخ، تصوف واخلاق، تذکرہ اور شعر وادب جیسے موضوعات پر چھوٹے بڑے متعدد مضامین ہیں، فاضل مصنف عربی وفارسی زبان پر قدرت کے ساتھ کثرت مطالعہ اور تحقیقی ذوق کے لیے معروف ہیں۔ انہوں نے حدیث نبویؐ کے اردو تراجم و تشریحات پر ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے لیکن بعض اہم فارسی کتابوں جیسے مونس الارواح، مرآۃ مداری، تاریخ داؤدی اور فتوحات فیروز شاہی کے ترجموں نے ان کو شہرت ووقعت بخشی، انہوں نے جن موضوعات پر کتابیں لکھی، قریب ان ہی تمام موضوعات کا احاطہ اس مجموعۂ نگارشات میں ہے۔ اسلامی مدارس، مسلمانوں کے علمی ذوق اور مسلمان اور فن خطاطی، غرض ساری تحریریں معلومات کی کثرت اور قلم کی متانت وشرافت کے ساتھ فکر وطبع کی سلامت کا دلکش نمونہ ہیں۔ فاضل مصنف کے احوال جناب نعیم الاسلام قادری کے قلم سے ہیں اور خوب ہیں۔ نگارشات کی افادیت ہر طبقہ کے لیے ہے، اس لیے توقع یہی ہے کہ اسے حسن قبول عطا ہوگا۔

مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ازمولانا نذر الحفیظ ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۶۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور لکھنؤ کے دوسرے مشہور مکتبے۔

گذشتہ صدی میں عالمی طور پر استعمار، اشتراکیت، نازیت، سرمایہ داری، مذہبی فرقہ واریت، تنگ نظر قومیت وعلاقائیت جیسی نظریاتی تحریکوں کا عروج وزوال تاریخ کا حصہ بنا، لیکن

صدی کے اواخر میں امریکی سرمایہ دارانہ استعمار نے نئے عالمی نظام کا جو فتنہ پیدا کیا وہ قیامت کا ثابت ہوا، صہیونی فکر نے انسانی تاریخ کی تمام قدروں کو پامال کرنے کے لیے جو ہتھیار سب سے کارگر اور فتنہ پرور ایجاد کیا وہ میڈیا کا ہے، اخباروں، رسالوں سے فلم، ریڈیو، ٹی وی، موبائل، انٹرنیٹ، یہ سب قیامت کی چال چلنے والے ذرائع ثابت ہوئے اور ان کی فتنہ جوئی کہیں سے کم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ امریکہ میں نائن الیون کے واقعہ کے بعد اس میڈیا کے اصل چہرے کا ذکر زبانوں پر آنے لگا۔ ایک حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ صہیونیت کی زد میں تو پورا عالم گردوں ہے لیکن خاص بلکہ اصل نشانہ مسلمان یا دوسرے الفاظ میں اسلام ہے۔ اس فتنہ کی زہرناکی کے پیش نظر زیر نظر کتاب کئی برس پہلے مستند جائزوں اور تجزیہ کی خوبی سے آراستہ ہوکر شائع ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ انگریزی، عربی، بنگلہ زبانوں میں ہوا، ہمارے سامنے اس کا جدید ترین پانچواں ایڈیشن جنوری ۲۰۱۴ء کا ہے۔ اس کا ہندی اور ملیالم ایڈیشن بھی شاید شائع ہو چکا ہے۔ فاضل مصنف کی محنت اور اس سے بھی زیادہ میڈیا کے کردار پر پہلی بار ایک بھرپور سنجیدہ بحث کی وجہ سے یہ غیر معمولی مقبولیت کی حامل ہوئی، کتاب کا آٹھواں باب اسلامی میڈیا، نظریہ اور عمل کے عنوان سے ہے، عالمی میڈیا کے تریاق کے طور پر اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ سب سے بڑھ کر اس ساری بحث کا اثباتی انداز ہے جو کسی بھی سیلاب بلا کا رخ موڑنے کی ہمت بخشتا ہے، آخری باب کا عنوان اسی رجائیت کا اعلان ہے کہ شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے۔ اپنے موضوع پر یہ منفرد ہے یا یہ دستاویزی شان رکھتی ہے، یہ زبان خلق کہتی ہے اور وہ بجا ہی کہتی ہے۔

معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی: از مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۶۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کا کانگر (نزد این، ڈی، ایم، سی پرائمری اسکول)، کا کانگر نئی دہلی-۳۔

بہار، مغربی بنگال اور ہریانہ جیسے صوبوں کے گورنر کی حیثیت سے جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی کو عام لوگوں نے جانا۔ عہدہ کیسے باوقار اور لائق بن جاتا ہے، سادگی اور خاموشی سے قومی و ملکی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جاتا ہے، اس کو بھی لوگوں نے ان کے طریقۂ کار سے

سمجھا لیکن گورنر کے عہدۂ بلند پر فائز ہونے سے پہلے کی بھی ان کی زندگی میں بعد کی نسل کے لیے بہت کچھ ہے، وہ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ کیمیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے اور اس کے بعد بڑی سے بڑی ذمہ داریاں ان کی لیاقت و صلاحیت سے وابستہ ہو کر نکھرتی رہیں۔ ایسی ہمہ عمل شخصیت بجائے خود تقلید کے لائق ہے، اس پر مستزاد شائستگی، تحمل اور بردباری کی وہ صفات جن کی وجہ سے ایک مضمون نگار نے بجا طور پر ''سراپا اخلاق'' کا عنوان دیا، اچھا ہوا کہ ایسے سراپا کردار و اخلاق کی زندگی کا ایک مرقع، مختلف مضامین و تاثرات کے ذریعہ فاضل مرتب نے اس کتاب میں پیش کر دیا، لکھنے والوں میں دور و قریب دونوں طرح کے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس اور سیاست، تعلیم اور تنظیم کے امتزاج سے وہ دلنواز پیکر تیار ہوا جس کو کوئی نام دیے جاسکتے ہیں، فاضل مرتب نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں اگر معمار قوم کا خطاب دیا تو یہ حسن تعبیر لائق داد ہے۔ اردو کے علاوہ کچھ انگریزی مضامین اور چند تصویریں بھی اس کتاب کی زینت ہیں، ایک مخلص، محبّ قوم اور اعلیٰ انسانی قدروں کی حامل شخصیت کے حالات دوسروں کے لیے روشنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکتساب نور کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔

صفحۂ دشت : از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۱۵ روپے، پتہ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸، مہاراشٹر۔

ساحل کی مناسبت سے اس مجموعۂ مضامین کا عنوان موج در موج ہونا چاہیے تھا لیکن شاید شرف اسی کے لیے ہے جو دشت نوردی کا خوگر ہو اور سرابوں سے گزر کر باغہائے تخیل کی دریافت میں کامیاب ہو۔ فاضل مصنف نے قریب سولہ مضامین کو اس مجموعہ کے حوالے کر کے صحیح کہا کہ یہی حاصل جستجو ہے، ایک حصہ میں مخطوطات کی باتیں ہیں، عقائد اعظم، غوثیہ، مدینۃ الانوار، ترجمہ شاہنامہ اور ایک نعتیہ قصیدہ سب کے سب نایاب مخطوطات، تلاش و تعارف سے ان کو نئی زندگی ملی ۔ باقی حصے میں وہ مضامین ہیں جن کو واقعی مضامین نو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، پامال موضوعات کی جگہ ہزبر لکھنوی، عجیب ناگپوری، کیف ٹونکی، شارق ایرایانی اور ترجمہ، استفادہ، توارد اور سرقہ جیسے مضامین نے صفحات دشت کو سرسبز و شاداب کر دیا، صفحہ دشت، کاغذ آتش زدہ ہو یا نہ ہو، ساحل

صاحب کے نقش پا میں گرمیٔ رفتار کی تپش بہرحال ہے۔انہوں نے ایک زندگی علم وادب کی خدمت میں گزاری، مجموعہ امراض ہوئے، بینائی کمزور سے کمزورتر ہوئی لیکن ان کے خرمن ادب میں انبار لگتے رہے۔انہوں نے صحیح کہا کہ ان مضامین کی اہمیت وافادیت کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو تلاش وتحقیق کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

صہبا وسمن: از جناب محشر عنایتی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۵۰روپے، پتہ: سلیم عنایتی ۷۵/۴۰، پریڈ، کانپور ۲۰۸۰۰۱۔

دبستان رام پور کے آسمان پر کچھ ستارے ایسے چمکے کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں اور ان تک نہ پہنچ سکیں جو اسی بساط انجم پر دور کہیں کسی گوشہ میں خود اپنے ہالہ میں گم کہہ رہے تھے کہ

مکمل کرگیا جل کر حیات غم کو پروانہ اور ایک ہم تھے کہ افسانہ بھی چھوڑا نا تمام اپنا

محشر عنایتی مرحوم کو خود اپنے ہونے کا احساس تھا اور شاید یہی شعور ذات، کسی شاعر کو دوسروں سے جدا اور نمایاں کرتا ہے۔

حقیقت ؟ کہاں میرے بعد کہ ابھریں گی پرچھائیاں میرے بعد

نیا نیا ہے ابھی جذبۂ خود آرائی خدا کرے کہ نہ آئے خیال یکتائی

نظام رامپوری کا انگڑائی والا شعر شاید ان کے ذہن میں تھا لیکن کس طرح ؟

حیات وعشق کے پر پیچ وخم نشیب وفراز ان ہی کا نام ہے شاید کسی کی انگڑائی

اسی غزل کا یہ شعر بھی کیا خوب ہے

تمام عمر میں پہنچا ہوں اس نتیجہ پر نشاط بزم سے بہتر ہے دور تنہائی

شاید اسی وجہ سے جناب عشرت ظفر نے ان کو محزونی نشاط کا شاعر کہا، مالک رام نے انفس وآفاق کا شاعر سمجھا، امتیاز علی عرشی مرحوم کی تمنا رہ گئی کہ عنایتی مرحوم دل بھر کے خیالات وجذبات کی مصوری کرتے۔ یہ سب سچ اور یہ بھی سچ کہ ع جاؤ قافلے والو ہم تو اجتہادی ہیں

غزلوں، نظموں اور قطعات ورباعیات کا یہ مجموعہ صہبا وسمن کا خوشگوار احساس ہے۔

ع۔ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-آسان سیرت النبیؐ: سید آصف الدین ندوی، انسٹی ٹیوٹ آف عربک، سکنڈ فلور، سعید کامپلکس، مہدی پٹنم حیدرآباد، تلنگانہ۔ قیمت =/۱۵۰ روپے

۲-اسلام اور مسلمان کچھ سوالات، کچھ اشکالات: پروفیسر اختر الواسع، البلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

۳-انتہا پسندی اور اس کا تدارک: حافظ محمد ابراہیم عمری، ادارہ تحقیقات اسلامی، عمر آباد۔ قیمت =/۶۰ روپے

۴-تنقیدات محمود (دوم): ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی، بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، وی۔ پی۔ کے ناکہ، بھیونڈی (تھانے)، ۴۲۱۳۰۲۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

۵-جو اکثر یاد آتے ہیں (کچھ خاکے کچھ مضامین): ڈاکٹر محمد ارشد، ادبی دائرہ رحمت نگر، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت =/۳۰۰ روپے

۶-حج بیت اللہ شریف: ارشد علی انصاری، عاصم امین ''نشان امین'' ۱۵-دلسنگارنز د جامع مسجد، اعظم گڑھ۔ قیمت =/۵۰ روپے

۷-رئیس المعالجات: ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی، قاسمیہ لائبریری، مبارک پور۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

۸-سمٹتا سائبان (سوانحی خاکے): ڈاکٹر شکیل احمد، فہیم بک ڈپو، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن۔ قیمت =/۱۲۰ روپے

۹-قرآنی مقالات از افادات شاہ صبغۃ اللہ حسینی: مرتب ڈاکٹر سید کمال اللہ بختیاری ندوی، مکتبۃ الشباب العلمیہ، ٹیگور مارگ ندوہ، لکھنؤ۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

۱۰-مفسر قرآن وداعی احسان حضرت مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بختیاریؒ، شخصیت، خدمات، ملفوظات اور ارشادات۔ ایک جامع تعارف: سید کمال اللہ بختیاری ندوی، مدرسہ باقیات صالحات، املوتمل ناڈو۔ قیمت =/۷۵ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	240/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	100/-
کلیات شبلی (اردو)	180/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
MARCH 2015 Vol- 195 (3)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 7607046300 (8.00 A.M. To 1:30 P.M.)

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب و ہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	// //	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	// //	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	// //	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	// //	225/-